مجلّہ طلوع اسلام کا اجراء 1938ء میں علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائد اعظمؒ کی خواہش پر عمل میں آیا

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدل الاشتراک
سالانہ
پاکستان۔ 170 روپے
غیر ممالک۔ 800 روپے

ٹیلیفون
5714546/6541521
idara@toluislam.com
خط و کتابت
ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) 25/بی گلبرگ II لاہور

قیمت فی پرچہ
15/-
روپے

شمارہ نمبر 01 | جنوری 1999ء | جلد 52

فہرست

لمعات	ادارہ	3
نہ ستیزہ گاہ جہاں نئی نہ حریف پنجہ شکن نئے	ادارہ	8
نظام ربوبیت کب اور کیسے قائم ہو گا؟	علامہ غلام احمد پرویز	13
توہین رسالت	ایاز حسین انصاری	21
قرآن کے مخاطب ان پڑھ تھے یا پڑھے لکھے؟	علامہ رحمت اللہ طارق	28
اسلامی نظام کا محور	علی محمد چدھڑ	31
کھلا خط	عبیدالرحمان ارائیں	37
علامہ اقبال اور قرآن	ڈاکٹر محمد معروف	42
اقبال اور قرآن	امبر حفیظ	47
حقائق و عبر	ادارہ	54
Jinnah, Islam and Pakistan	Tarik Jan	64

ایڈیٹر محمد لطیف چوہدری ناشر عطاالرحمان ارائیں، مقام اشاعت 25- بی گلبرگ II لاہور
مطبوعہ نذیر شریف پرنٹرز، 43 ریٹی گن روڈ، لاہور

PAMPHLETS -- پمفلٹ

ادارہ طلوع اسلام دینی موضوعات پر پمفلٹس شائع کرتا رہتا ہے۔ مندرجہ ذیل پمفلٹس دو روپے فی پمفلٹ کے حساب سے ڈاک ٹکٹ بھجوا کر طلب فرمائیں۔

1 اسلام کیا ہے؟	2 الزکوٰۃ
3 کیا قائداعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟	4 کافرگری
5 سوچیو (سندھی)	6 سوچا کرو
7 اسلام ہی کیوں سچا دین ہے؟	8 الصلوٰۃ
9 مرض تشخیص اور علاج	10 مقام اقبالؒ
11 دو قومی نظریہ	12 روٹی کا مسئلہ
13 جہاں مارکس ناکام رہ گیا	14 حرام کی کمائی
15 مرزائیت اور طلوع اسلام	16 مقام محمدی ﷺ
17 خدا کی مرضی	18 دعوت پرویز کیا ہے؟
19 فرقے کیسے مٹ سکتے ہیں؟	20 قرآن کا سیاسی نظام
21 ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ	22 Islamic Ideology
23 آرٹ اور اسلام	24 احادیث کا صحیح ترین مجموعہ
25 ماؤزے تنگ اور قرآن	26 ہم میں کریکٹر کیوں نہیں؟
27 عالمگیر افسانے	28 عورت قرآن کے آئینے میں
29 اندھے کی لکڑی	30 بنیادی حقوق انسانیت اور قرآن
31 قرآن کا معاشی نظام	32 قوموں کے تمدن پر جنسیات کا اثر
33 اسلام آگے کیوں نہ چلا؟	34 اسلامی قوانین کے راستے میں کون حائل ہے؟
35 Is Islam a Failure?	36 Why Islam is the Only True Deen?

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند

پاکستان کے حالات جس حد تک بگڑ چکے ہیں اور جس تیزی سے اور بگڑتے جا رہے ہیں اس کے متعلق کسی شرح و بسط سے کہنے کی ضرورت نہیں۔ وہ کونسی آنکھ ہے جو ہر روز اس عبرت انگیز منظر کا تماشا نہیں کرتی اور وہ کونسا دل ہے جو ہر آن اس الم انگیز حقیقت کا احساس نہیں کرتا۔ حالات کی یہ خرابی نہ کسی خاص خطہ تک محدود ہے نہ کسی خاص طبقہ سے مخصوص۔ یہ اس حد تک عالمگیر ہو چکی ہے جس کے متعلق قرآن نے کہا تھا کہ کَانَ شَرُّہٗ مُسْتَطِیْرًاo 76:7)۔ جس کی تباہیاں متعدی امراض کے جراثیم کے مانند اس طرح فضا میں پھیلی ہوئی ہوں کہ آپ لاکھ بچنے کی کوشش کریں وہ آپ تک اڑ کر پہنچ جائیں۔ ان کی شدت' وسعت اور گہرائی کا اس سے اندازہ لگایئے کہ (عوام تو ایک طرف) وہ ارباب حل و عقد' جو امور مملکت کے انتظام و انصرام کے ذمہ دار ہیں' بالکل بوکھلائے ہوئے پھر رہے ہیں اور کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس ابتری کا علاج کیا ہے۔ ان کی یہی پریشانیٔ فکر و نظر اور سراسیمگیٔ قلب و نگاہ ہے جس کی وجہ سے حالت یہ ہو چکی ہے کہ وہ اس گتھی کو جس قدر سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں یہ اتنی ہی الجھی چلی جاتی ہے۔ ان حالات کا نتیجہ یہ ہے کہ سارا ملک ایک عالمگیر مایوسی کی لپیٹ میں آچکا ہے اور کسی کی نظروں کے سامنے امید کی کوئی کرن دکھائی نہیں دیتی۔ ہر شخص اپنے آپ کو یوں بے بس محسوس کر رہا ہے گویا وہ ایک تناور درخت کے ساتھ مضبوط زنجیروں سے بندھ رہا ہے اور سامنے آتش فشاں پہاڑ سے' جہاں سوز لاوے کا سیلاب اس کی طرف امنڈے چلا آرہا ہے۔ یَقُوْلُ الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ اَیْنَ الْمَفَرُّo 75/10

سوال یہ ہے کہ کیا ان حالات کے سدھرنے کی کوئی شکل ہو سکتی ہے؟ کیا ان خرابیوں کا کوئی علاج ہے؟ کیا ہم اس بے پناہ عذاب سے نجات پا سکتے ہیں؟ کیا ہماری باز آفرینی کی کوئی صورت نکل سکتی ہے؟ نظر بظاہر ان سوالات کا جواب نفی میں ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ملک میں ایک طبقہ ایسا بھی موجود ہے جو ان خرابیوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے اور اس سے عوام میں اور زیادہ بددلی اور بداعتمادی پھیلاتا ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جو نہ پہلے پاکستان کی تشکیل کے حق میں تھا اور نہ اب اس کے دل میں اس کے استحکام و بقا کے لئے خیر سگالی کے جذبات ہیں۔ لیکن یہاں وہ طبقہ بھی تو موجود ہے جو پہلے بھی صدقِ دل سے پاکستان کے حصول میں کوشاں تھا اور اب بھی پوری دیانت سے اس کے قیام و بقا کا خواہشمند ہے۔ ہم دیکھتے یہ ہیں کہ ان خرابیوں کا کوئی موثر علاج ان کی سمجھ میں بھی نہیں آتا بالفاظِ دیگر' ایسا نظر آتا ہے کہ اس مسئلہ کا حل ہماری عقل و فکر کی حد سے آگے ہے۔ اس تک ہمارے محدود ذہنوں کی رسائی نہیں ہو سکتی۔

دنیا میں جو قومیں انسانی معاملات کو سلجھانے کے لئے انسانی عقل و فکر ہی کو آخری ذریعہ سمجھتی ہیں ان کے لئے

یہ صورتِ حالات جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے فی الواقعہ ناامیدی اور بے بسی کی آخری حد ہے۔ ان کے لئے اس کے سوا چارہ ہی نہیں کہ وہ یہ کہہ کر مایوس ہو جائیں کہ ان مشکلات پر قابو پا لینا ہماری دسترس سے باہر ہے۔ لیکن انسانوں کا ایک اور گروہ ہے جو ایسے حالات میں بھی مایوس نہیں ہو سکتا۔ ان کے متعلق مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ کوئی جانور کتنا ہی بھوکا کیوں نہ ہو' اگر گھاس کسی ایسی جگہ رکھی ہے جو اس کی رسی کی لمبائی سے آگے ہے تو اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں کہ وہ انتہائی مایوسی کے عالم میں اس گھاس کی طرف حسرتناک نگاہوں سے دیکھتا رہے اور بھوک سے مر جائے۔ لیکن یہی صورت کسی انسان کے ساتھ پیش آجائے تو وہ ایسے موقعہ پر مایوس ہو کر نہیں بیٹھ جاتا بلکہ کسی ایسے ذریعے کی تلاش کرتا ہے جو شے مطلوب تک پہنچ جائے۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ جب کسی بچے کا ہاتھ بسکٹوں کے ڈبے تک نہیں پہنچتا تو وہ کسی تپائی یا کرسی پر کھڑا ہو کر اپنا ہاتھ اس تک لے جاتا ہے۔ انسان اور حیوان میں بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ انسان اوزار (Instruments) بنانا جانتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو چیز اس کے "حیوانی ہاتھ" کی دسترس سے باہر ہو یہ اس تک بھی پہنچ جاتا ہے۔ جو کام انسانی ہاتھ کے لئے اوزار کرتا ہے (یعنی اس کی دسترس کی حدود کو وسیع کر دیتا ہے) وہی کام انسانی عقل کے لئے وحی کرتی ہے یعنی جو مقام تنہا عقلِ انسانی کی حد سے ماوراء ہو اگر وہی عقل وحی کی راہ نمائی کے تابع چلے تو وہ مقام اس کی دسترس کے اندر آجاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر' جس طرح عام حیوانوں سے وہ انسان آگے ہوتا ہے جو اوزار بنانا جانتا ہے۔ اسی طرح عام انسانوں سے وہ انسان آگے ہوتا ہے جو اپنی عقل سے وحی کی روشنی میں کام لیتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ مقام جہاں پہنچ کر ایک ایسا انسان قطعاً" مایوس ہو کر بیٹھ جاتا ہے جو انسانی مشکلات کے حل کے لئے عقلِ انسانی ہی کو واحد اور آخری ذریعہ سمجھتا ہے وہ مقام اس انسان کے لئے قطعاً" مایوسی کا مقام نہیں ہوتا جو اپنی عقل سے وحی کی راہ نمائی میں کام لیتا ہے۔ وحی کی روشنی اس کی عقل کی حدود کو وسیع کر دیتی ہے۔

جن حالات سے ہم دوچار ہیں ان میں (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) ایک ایسی قوم کے لئے فی الواقعہ امید کی کوئی کرن باقی نہیں رہ سکتی جو انسانی مشکلات کے حل کے لئے عقلِ انسانی ہی کو چارہ ساز سمجھے۔ لیکن ہمارا شمار تو ان قوموں میں نہیں ہونا چاہئے۔ ہم تو وحی پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی اس کے مدعی بھی ہیں (اور بجا طور پر مدعی) کہ خدا کی آخری وحی اپنی اصلی حالت میں ہمارے پاس موجود ہے۔ لیکن یہ حقیقت کس قدر تاسف انگیز اور عبرتناک ہے کہ اس ایمان اور دعوے کے باوجود عملاً ہماری حالت وہی ہے جو ان اقوام کی ہونی چاہئے جو وحی کی راہنمائی پر ایمان نہیں رکھتیں اور تنہا فکرِ انسانی ہی کو خضرِ راہ سمجھتی ہیں۔ آپ غور کیجئے کہ حالات کو سدھارنے اور مشکلات پر قابو پانے کے لئے جس قدر تجاویز مختلف گوشوں سے سامنے لائی جاتی ہیں' ان میں وحیِ خداوندی کی طرف کہیں دور کا بھی اشارہ ہوتا ہے؟ کہیں نہیں ہوتا۔ کبھی نہیں ہوتا۔ ہم ان مشکلات کا حل اسی نہج پر تلاش کرتے ہیں جس پر وہ قومیں حل ڈھونڈھتی ہیں جو وحی پر ایمان نہیں رکھتیں۔ یا جن کے پاس وحیِ الٰہی منزہ شکل میں موجود نہیں۔ اس سے دو ہی باتیں ظاہر ہوتی ہیں یا تو یہ کہ ہم وحیِ خداوندی پر دل کی گہرائی سے ایمان ہی نہیں رکھتے۔ ہمارا اقرار محض رسمی اور زبانی ہے اور یا یہ کہ ہم وحیِ الٰہی کو آزما کر اس نتیجہ پر پہنچ چکے ہیں کہ اس کی راہ نمائی بھی کشودِ کار کی کوئی صورت پیدا نہیں کر سکتی۔ انسانی معاملات کا حل انسانی عقل ہی کی رو سے ممکن ہے اور جو مقام انسانی عقل کی حد سے آگے ہو وہاں تک وحی کی بھی رسائی نہیں ہوتی۔ جہاں تک قوم کی حالت کا ہم مطالعہ کر سکے ہیں یہ نظر

آتا ہے کہ قوم میں اس وقت تین نمایاں طبقے ہیں۔ ایک طبقہ تو وہ ہے جو خدا۔رسول۔ وحی وغیرہ کے الفاظ محض رسماً دہرا دیتا ہے۔ انہیں قطعاً معلوم نہیں کہ ان الفاظ کا مفہوم کیا ہے اور انسان کی عملی زندگی سے ان کا واسطہ کیا؟ یہ عوام کا طبقہ ہے۔ دوسرا طبقہ مذہب پرست حضرات کا ہے۔ جن کا ایمان یہ ہے کہ وحی (یا مذہب) کا تعلق انسان کی آخرت سے ہے۔ اس دنیا کے معاملات سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ تیسرا طبقہ وہ ہے جو (مذہب پرست طبقہ کی ذہنی اور عملی حالت سے اندازہ لگا کر) اس نتیجہ تک پہنچ چکا ہے کہ مذہب اور اس کے متعلقات' انسان کے دورِ جہالت کی یادگار ہیں۔ عقل و علم کی (موجودہ) دنیا میں ان کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ اس وقت ہمیں کوئی ایسا طبقہ نظر نہیں آتا (افراد تو یقیناً ہیں' لیکن کوئی نمایاں طبقہ ایسا نہیں) جو اس حقیقت پر علیٰ وجہ البصیرت یقین رکھتا ہو کہ وحی کی راہ نمائی ان مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتی ہے جن کی گرہ کشائی تنہا عقل کے بس کی بات نہیں۔

اس صورتِ حالات کا نتیجہ' جو اوپر بیان کی گئی ہے بڑا تباہ کُن ہوتا ہے۔ اس سے یہی نہیں ہوتا کہ ایسی قوم وحی کی برکات سے محروم رہ جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ قوم انسانی عقل سے بھی کماحقہ' فائدہ نہیں اٹھا سکتی۔ اس کے سینے کی کشمکش' ذہنی تذبذب اور قلب و زبان میں عدم موافقت ایک ایسی کیفیت پیدا کر دیتی ہے جس میں اس کی فکری صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں اس قسم کی "مذہب پرست" قومیں عقل و فکر کے میدان میں ہمیشہ ان قوموں سے پیچھے رہ جاتی ہیں جو تنہا عقل کو کشورِ کار کا ذریعہ سمجھتی ہیں اور کھلے بندوں اس کا اعلان کرتی ہیں۔ ان میں "ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر"۔ کی کشاکش (Inhibition) نہیں ہوتی۔

یہ ہے اس وقت ملک کی عام حالت۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہمیں اس حقیقت پر پورا پورا یقین ہے کہ وحی کی راہ نمائی ان مشکلات کا حل بھی عطا کر دیتی ہے۔ جن سے عہدہ برآ ہونا تنہا عقل کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ یعنی وحیِ خداوندی عقلِ انسانی کے دائرہ کو اور وسیع کر دیتی ہے۔ جس مقام پر عقلِ انسانی کے چراغ ٹمٹمانے لگتے ہیں وہاں وحیِ خداوندی کا خورشید جہانتاب جلوہ بار ہو کر انسان کے ذہنی افق کو مطلعِ انوار بنا دیتا ہے۔ لہٰذا جس مقام پر اور جو بالکل ہار تھک کر بیٹھ جاتے ہیں ہم وہاں بھی قطعاً مایوس نہیں ہوتے۔اس حقیقت کو قرآن نے قصۂ آدم کے تمثیلی رنگ میں بڑے حسن کارانہ انداز سے بیان کیا ہے (اور یہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ قصۂ آدم درحقیقت خود آدمی ہی کی داستان ہے)۔ وہ کہتا ہے کہ جب اس کی غلط روش کی بناء پر آدم سے جنت چھن گئی تو وہ بہت مایوس ہو گیا۔ اس لئے کہ وہ اس افتاد سے تنہا عقل (ابلیس) کی مدد سے بچنا چاہتا تھا اور یہ چیز تنہا عقل کی دسترس سے باہر کی تھی۔ اس پر آدم نے خدا سے کہا کہ کیا میری یہ پستی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایسی ہی رہے گی؟ کیا میں اب ابدی طور پر خاسر و نامراد ہو چکا ہوں؟ کیا یہ فردوسِ گم گشتہ مجھے دوبارہ کبھی نہیں مل سکے گا؟ کیا میری باز آفرینی کی اب کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکے گی؟ جواب ملا کہ نہیں! تمہارے لئے ابدی طور پر مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔ تمہاری پستی پھر سے امیدوں میں اور تمہاری پستی عروج میں بدل سکتی ہے۔ اس سے آدم کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی اور اس نے پوچھا کہ وہ کیسے! جواب ملا کہ **فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ** (2:38)۔ میری طرف سے تمہارے پاس راہ نمائی آتی رہے گی۔ سو جو لوگ اس راہ نمائی کے پیچھے پیچھے چلیں گے انہیں نہ کسی قسم کا خوف رہے گا نہ حزن۔ اس حقیقت کو قرآن نے خود امت محمدیہ کی داستان کے سلسلے

میں دہرایا ہے۔ سورہ آل عمران میں پہلے یہ کہا گیا کہ یاد رکھو! انسان کے لئے کامیابی و کامرانی کی ایک ہی راہ ہے اور وہ راہ ہے اس ضابطۂ حیات کی اتباع' جسے دین خداوندی (یا الاسلام) کہا جاتا ہے۔ جو شخص اس شاہراہِ حیات سے ہٹ کر' کوئی اور نظامِ زندگی اختیار کر لے گا تو کائنات کی میزان میں اس کی اس روش کا کوئی وزن نہیں ہو گا اور اس کا مستقبل تاریک سے تاریک تر ہوتا چلا جائے گا (وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ (3:84)- اس کے بعد اس نے کہا ہے کہ جو قوم ایک بار اس صحیح راستہ پر چل کر اسے چھوڑ دے تو اس کی حالت کیا ہو گی؟ اس کی حالت یہ ہو گی کہ اسے کامرانیوں کی راہ کبھی نہیں مل سکے گی۔ كَيْفَ يَهْدِى اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ذرا سوچو کہ خدا (کا قانونِ ہدایت) بھلا اس قوم کو راہ نمائی کس طرح دیدے گا جو ایک دفعہ اس پر ایمان لا کر پھر اس سے انکار کر دے۔ راہ نمائی کے لئے شرط تو یہ ہے کہ اس کی تحکیمت پر مسلسل ایمان رہے۔ جسے اس پر ایمان ہی نہ رہے وہ قوم اس کی نفع بخشیوں سے فیضیاب کس طرح ہو سکتی ہے؟ اور پھر اس نے کفر کی راہ بھی اس حالت کے بعد اختیار کی ہو کہ اس نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیا تھا کہ جب خدا کے رسولؐ نے اس دین کو عملاً متشکل کیا تھا تو وہ تمام دعاوی جو اس نے اس قوم سے کر رکھے تھے کس طرح ایک ایک کر کے پورے ہوئے تھے (وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ) اور ان کے پاس وحی کا ضابطۂ حیات کھلے کھلے طور پر آچکا تھا (وَجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ) اس قسم کی ظالم قوم کو خدا کی راہ نمائی کیسے مل سکتی ہے (وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ) (3:85)- اس کے بعد یہ کہا کہ اس قوم کی اس روگردانی کا نتیجہ کیا ہو گا؟ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ۝ (3:86-87)- اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ یہ قوم ان برکات سے بھی محروم ہو جائے گی جو نظامِ خداوندی کی رو سے حاصل ہوئی تھیں اور ان مفادات سے بھی محروم جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے سے مل سکتی تھیں اور اس تائید و تقویت سے بھی محروم جو دوسری قوموں سے برابری کے آبرومندانہ معاملات سے میسر آسکتی تھی۔ وہ ذلت و پستی کے اس عذاب میں مبتلا رہے گی۔ اس عذاب کی سختی میں اس بناء پر ذرا بھی کمی نہیں ہو گی کہ وہ زبان سے خدا اور رسول پر ایمان کی مدعی تھی اور نہ ہی ان کی اس غلط روش کے نتائج میں تاخیر کی جائے گی کہ وہ اس دنیا میں نمودار نہ ہوں۔ آخرت ہی میں جا کر سامنے آئیں۔

غور کیجئے کہ کیا قرآن نے ان آیات میں ہو بہو ہماری تصویر کھینچ کر نہیں رکھ دی؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ داستان ہے ہی ہماری اپنی۔ ہمیں وہ ہیں جنہوں نے ایمان کے بعد کفر کی روش اختیار کر لی۔ حالانکہ ہم اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کر چکے تھے کہ اس ایمان کے نتائج کس قدر درخشندہ تھے اور آج بھی اس امر کی شہادت بہم پہنچاتے رہتے ہیں کیونکہ ہم ہر منبر اور ہر اسٹیج سے ببانگِ دہل اعلان کرتے رہتے ہیں کہ جب (صدر اول کے) مسلمانوں نے قرآن پر عمل کیا تو وہ کس طرح دیکھتے ہی دیکھتے ساری دنیا پر چھا گئے۔ لیکن ہماری یہ شہادت محض لفاظی تک محدود ہوتی ہے۔ ہم دل سے وحی کی اس حیات بخش قوت پر ایمان نہیں رکھتے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہماری یہ محرومیِ ابدی ہو چکی ہے یا اس سے رستگاری کی کوئی صورت بھی پیدا ہو سکتی ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ ہاں! ہو سکتی ہے۔ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ ہاں! اس عذاب سے وہ لوگ بچ جائیں گے جو اس مقام پر لوٹ کر آجائیں گے جہاں سے ان کا قدم غلط سمت کی طرف اٹھ گیا تھا۔ وہاں جا کر پھر سے

راستہ پہ گامزن ہو جائیں گے (اَصْلَحُوْا) اور اپنے اندر زندہ رہنے کی صلاحیتیں پیدا کر لیں گے۔ اگر وہ ایسا کریں تو اللہ کا نظام ہر قسم کی تباہیوں سے ان کی حفاظت بھی کرے گا اور ان کی نشوونما کا سامان بھی بہم پہنچا دے گا۔ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (3:88)۔

یہ ہے وہ شعاعِ امید جو موجودہ حالات کی گھٹا ٹوپ تاریکیوں میں ہمیں افقِ قرآن سے بایں ہمہ تابناکی و درخشانی ہے قرآن کے اس دعوے پر ہمارا ایمان ہے۔ یہ ایمان نہ تو مُلّا کے اس ایمان کی طرح ہے جس کا عملاً مفہوم کچھ نہیں ہوتا اور نہ ہی لیڈرانِ قوم کے ایمان جیسا ہے جس سے تقریر میں گرمجوشی پیدا کرنے سے زیادہ کچھ مقصود نہیں ہوتا۔ ہمارا یہ ایمان عَلٰی وَجْہِ البصیرت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس کا کوئی متلاشی ہو تو ہم اسے قرآن سے پورا پروگرام مرتب کر کے دے سکتے ہیں۔ جو ہمیں ہماری مشکلات کے جہنم سے نکال کر کامیابی و کامرانی کی منزل کی طرف لے جا سکتا ہے۔ ہم یہ دعویٰ دل کے پورے اطمینان اور ذہن کے پورے اعتماد سے کر رہے ہیں۔ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ (86:13-14)۔

اور یہی ہے روشنی کا وہ بلند مینار جو حوصلہ شکن اور یاس انگیز حالات کے بحرِ ظلمات میں ہمارے لئے اپنے اندر تولیدِ حیات اور پیامِ اُمید رکھتا ہے اور لب ہائے شکوہ سنج و شکایت آمیز کو زمزمہ بار اور شکر ریز بنا دیتا ہے۔ یہی ہے وہ نشیدِ جاں فزا جسے سنکر ہم بے اختیار پکار اٹھتے ہیں کہ

مژدہ صبح دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند وز خورشید نشانم دادند
رخ کشودند و لبِ ہرزہ سرایم بستند
دل ربودند و دو چشمِ نگرانم دادند

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (5:16)۔

اپیل

اگرچہ کراچی شہر کو تحریک طلوع اسلام کا اولین گہوارا ہونے کا شرف حاصل ہے اور اہالیان کراچی درس قرآن کی اس روایت کو جس کی طرح علامہ غلام احمد پرویزؒ نے ڈالی تھی اسی طرح قائم رکھے ہوئے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ اتنی بڑی آبادی والے اس مالدار شہر میں کوئی مستقل قرآنی درسگاہ آج تک قائم نہیں کی جا سکی لہٰذا قرآنی فکر سے دلچسپی رکھنے والے حضرات سے اپیل ہے کہ وہ جس قدر جلد ہو سکے ہماری مالی معاونت فرما کر کراچی میں مستقل قرآنی درسگاہ قائم کرنے میں ہمارا ہاتھ بٹائیں۔ عطیات بزم طلوع اسلام کراچی (صدر) اکاؤنٹ 1-60299' حبیب بینک لمیٹڈ (کورنگی روڈ برانچ (1910) فیز II۔ ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی کے نام ارسال فرمائیں۔

بزم طلوع اسلام کراچی (صدر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(ادارہ)

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی نہ حریفِ پنجہ شکن نئے

(محترم پرویز صاحب کی ایک تقریر (نومبر 1956ء) سے اقتباس)

برادرانِ گرامی قدر! انگریزی میں کہا کرتے ہیں (Truth is Stranger than Fiction) یعنی بعض حقیقتیں افسانوں سے بھی زیادہ تعجب انگیز ہوتی ہیں۔ آپ کسی اجنبی سے کہئے کہ ایک قوم ہے جس کا یہ ایمان ہے (یعنی محض خیال نہیں بلکہ ایمان) کہ دنیا میں ایک کتاب ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں ان کی راہ نمائی کے لئے خدا کی طرف سے بذریعہ وحی عطا ہوئی ہے۔ اس کا ایک ایک حرف محفوظ ہے۔ ساری دنیا کے انسان مل کر بھی اس کی مثل و نظیر مرتب نہیں کر سکتے۔ یہ کتاب سفرِ زندگی میں اس راستے کی طرف راہ نمائی کرتی ہے جو سب سے زیادہ سیدھا، سب سے زیادہ متوازن اور سب سے زیادہ محکم ہے۔ اس کے مطابق زندگی بسر کرنے سے اس دنیا میں بھی عزت و عظمت، شان و شوکت، قوت و حشمت اور حکومت و سطوت ملتی ہے اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی سرفرازی و سربلندی۔ انہیں اس کا بھی اعتراف ہے (اور اس اعتراف کا وہ ہر مقام پر اعلان کرتے رہتے ہیں) کہ ان کی ذلت و پستی، نکبت و زبوں حالی، بیچارگی و درماندگی کا واحد سبب یہ ہے کہ انہوں نے اس کتابِ عظیم کو پسِ پشت ڈال رکھا ہے۔ آپ اس اجنبی سے یہ سب کچھ کہیں اور اس کے بعد اسے بتائیں کہ اس کے ساتھ ہی اس قوم کی حالت یہ ہے کہ جب کوئی خدا کا بندہ انہیں اس کتاب کی طرف دعوت دیتا ہے تو وہ قوم پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ جاتی ہے اور اس کی مخالفت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتی لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا ۝ (72:19)۔ اس قوم کے بڑے بڑے راہ نمایانِ شریعت اور بادیانِ طریقت جگہ بہ جگہ لوگوں سے کہتے پھرتے ہیں کہ لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ۔ دیکھنا! اس کتاب کا ایک لفظ بھی تمہارے کان میں نہ پڑنے پائے۔ تم نہ اسے خود سننا نہ کسی اور کو سننے دینا۔ یہ بھی یاد رکھو کہ تم اس آواز کو دلائل و براہین سے دبا نہیں سکو گے۔ اس لئے اسے ناکام بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ جہاں دیکھو کہ اس کتاب کا ذکر ہو رہا ہے اَلْغَوْا فِيْهِ بس شور مچانا شروع کر دو۔ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ۝ (41:26) اس سے توقع ہو سکتی ہے کہ تم اس دعوت کو ناکام بنا سکو۔ وہ گلی گلی، محلے محلے اس کی تلقین کرتے اور اس آواز کو بلند کرنے والوں کے خلاف بہتان تراشیوں اور دروغ بافیوں سے عوام کے جذبات کو اس طرح بھڑکاتے رہتے ہیں کہ يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۝ (22:72)۔ یوں نظر آتا ہے جیسے یہ ان پر بپھرے ہوئے شیر کی طرح حملہ کر دیں گے، اس جرم کی پاداش میں کہ یہ انہیں قرآن کی طرف دعوت کیوں دیتے ہیں؟

کہئے کہ وہ اجنبی اسے سن کر کیا کہے گا؟ کیا یہی نہیں کہے گا کہ واقعی بعض حقیقتیں افسانوں سے بھی زیادہ تحیر انگیز ہوتی ہیں؟ اجنبی تو ایک طرف۔ اس واقعہ کو

خود اپنوں سے بیان کیجئے تو وہ بھی اسے بمشکل باور کریں گے۔ وہ بھی یہی کہیں گے کہ نہیں صاحب! بات کچھ اور ہو گی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو لوگ ساری عمر اٹھتے بیٹھتے قرآن۔ قرآن پکارتے رہتے ہیں۔ جن کی ہر بات کا آغاز بھی قرآن سے ہوتا ہے اور انجام بھی قرآن پر۔ وہ دعوت الی القرآن کی اس طرح مخالفت کریں؟ اور تو اور، جب تک ذاتی طور پر اس کا تجربہ نہیں ہوا خود میری سمجھ میں بھی یہ بات نہیں آتی تھی کہ مسلمان قرآن کی مخالفت کس طرح کر سکتا ہے۔

آپ قرآن کو محض انفرادی وعظ و نصیحت کے طور پر پیش کریں تو اس کی مخالفت کہیں سے نہیں ہو گی۔ لیکن جب آپ اسے دین یعنی ایک اجتماعی نظام کی شکل میں پیش کریں گے تو مخالفت کا ہجوم چاروں طرف سے سیلابِ بلا کی طرح امنڈ آئے گا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ قرآن، خدا اور بندے کے درمیان کسی قوت کو حائل نہیں ہونے دیتا۔ وہ اپنے محکم نظام کے ذریعے براہِ راست خدا کے قانون کی اطاعت سکھاتا ہے۔ اس سے وہ تمام قوتیں جو خدا اور انسان کے درمیان حائل ہوتی ہیں یوں ناپید ہو جاتی ہیں جس طرح طلوعِ آفتاب سے رات کی تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں۔ اس سے نہ اربابِ شریعت کی خدائی مسندیں باقی رہتی ہیں نہ ہادیانِ طریقت کی الوہیاتی عظمتیں۔ ظاہر ہے کہ یہ حضرات اسے کسی صورت میں بھی گوارا نہیں کر سکتے۔ حکومت کی لذت تو ایسی بلا ہے کہ قیلوں کا میٹ اپنی جمعداری نہیں چھوڑنا چاہتا۔ اس لئے یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ حضرات اپنے اس قسم کے اقتدار کو آسانی سے چھوڑ دیں جس کا تسلط جسموں کے بجائے دل اور دماغ پر ہو اور جسے قائم کرنے اور استوار رکھنے کے لئے نہ فوج اور پولیس کی ضرورت ہو نہ گولہ بارود کی حاجت۔ لوگ انہیں سجدے بھی کریں اور نذرانے بھی پیش کریں۔ گالیاں بھی کھائیں اور پاؤں بھی دبائیں۔ ان کا ہر حکم خدا کا حکم اور ہر فیصلہ رسول کا فیصلہ مانا جائے جس کی علانیہ خلاف ورزی تو ایک طرف، دل میں بھی اس کے خلاف ذرا سی گرانی، انسان کو دنیا میں روسیاہ اور قیامت میں جہنم کا ایندھن بنا دے۔ کہئے کہ اس قسم کی حکومت وسطوت اور عزت و عظمت کو کون آسانی سے چھوڑنے پر آمادہ ہو سکتا ہے؟ اگر آپ کوئی تحریک اس قسم کی پیش کریں جس میں خدا کے ساتھ ان نمائندگانِ خدا کی قوت کو بھی تسلیم کر لیا جائے تو یہ مطمئن رہتے ہیں۔ اس لئے کہ ایسی تحریک اور اس قسم کے مذہب میں خدا کا نام محض تبرکاً لیا جاتا ہے۔ عملی اقتدار و اختیار سب انہی نائبینِ خدا کے ہاتھ میں رہتا ہے۔ لیکن اگر کوئی اس قسم کے نظام کی طرف دعوت دے جس میں حکمرانی صرف خدا کے قانون کی ہو تو یہ اس کے تصور تک کو برداشت نہیں کر سکتے۔ وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ (39:45)۔ جب ان لوگوں کے سامنے جو مستقبل کی زندگی پر ایمان نہیں رکھتے (اور جن کے پیشِ نظر صرف اپنا مفادِ عاجلہ ہوتا ہے) تنہا خدا کا نام لیا جائے۔ یعنی ان سے کہا جائے کہ اطاعت صرف خدا کے قانون کی ہے اور کسی کی نہیں تو ان کے دل غم و غصہ سے طلسمِ پیچ و تاب بن جاتے ہیں۔ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ (39:45)۔ اور جب خدا کے سوا اوروں کا نام لیا جائے تو خوشی سے ان کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔ وَلَّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا (17:46)۔ تنہا خدا کا نام سن کر یہ نفرت و انتقام کے جذبات سے مغلوب ہو کر منہ پھیر کر چل دیتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ (12:106)۔ ان میں سے اکثر خدا پر ایمان اس طرح لاتے ہیں کہ اس کے ساتھ شرک بھی کئے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ ایمان کا تو تقاضا ہی یہ ہے کہ فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ

(40:14)- خدا کو پکارو تو اس طرح کہ فرماں پذیری اور اطاعت گذاری کے تمام تر دم و تمنات خالصتہً اسی کے قانون کے لئے مختص ہو جائیں۔ **وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ** (40:14)- خواہ مخالفین یعنی توحید کے منکرین کو یہ بات کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گذرے۔

مذہبی پیشوائیت سے آگے بڑھئے تو قرآنی نظام کی بطشِ شدید اس کی محکم گرفت۔ نظام سرمایہ داری پر پڑتی ہے۔ اس میں نہ کسی لیڈر کی لیڈری باقی رہتی ہے نہ زمیندار کی زمینداری۔ نہ جاگیردار کی جاگیرداری قائم رہتی ہے' نہ کارخانہ دار کی کارخانہ داری۔ نہ کسی کے پاس قارون کے خزانے رہتے ہیں نہ شداد کا بہشت۔ اس میں اللہ کے عطا کردہ رزق کے سرچشمے اللہ کے بندوں کی ضروریات کے لئے کھلے رہتے ہیں۔ لہٰذا یہ تمام قوتیں جو رزق کے سرچشموں پر سانپ بن کر بیٹھی ہوتی ہیں اس آواز کو دبانے کے لئے متحد و منظم ہو جاتی ہیں جو قرآنی نظام کو متشکل کرنے کے لئے اٹھے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے کہا ہے کہ خدا کے نظامِ ربوبیت کے قیام کے لئے جب اور جہاں کوئی انقلابی آواز اٹھی' مترفین کے طبقہ کی طرف سے اس کی مخالفت سب سے پہلے ہوئی۔ **وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ** (34:34)- یہ تاریخ کی بیّن حقیقت ہے کہ دنیا کی کسی قوم کی طرف بھی خدائی انقلاب کا پہنچانے والا کوئی ایسا نہیں آیا جس کی مخالفت اس قوم کے سرمایہ دار طبقہ کی طرف سے نہ ہوئی ہو اور انہوں نے یہ نہ کہا ہو کہ ہم تمہارے نظام کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ مترفین کا طبقہ' بایں ہمہ ساز و براق اور قوت و دولت' اس انقلابی آواز کے مقابلہ میں نکھر کر سامنے نہیں آتا۔ یہ ہمیشہ مذہبی پیشوائیت کو آگے بڑھاتا ہے۔ ہر فرعون' صاحبِ ضربِ کلیم کے مقابلہ کے لئے ہامان کے لاؤ لشکر کو میدان میں بھیجتا ہے۔ انقلابِ خداوندی کی یہ آواز علم و بصیرت اور دلائل و براہین کی آواز ہوتی ہے۔ دھاندلی اور جہالت کی آواز نہیں ہوتی۔ اس لئے اس کی مخالفت بھی (جسے کرنی ہو) علم و بصیرت اور دلائل و براہین سے کرنی چاہیئے۔ لیکن یہ نظام ایسے واضح حقائق کی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے' کہ اس کے خلاف کسی کو دلیل و برہان مل ہی نہیں سکتی۔ **وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ** (23:117)- لہٰذا جب مذہبی پیشوائیت' سرمایہ داری کی سپر بن کر' اس انقلابی آواز کے مقابلے کے لئے میدان میں آتی ہے تو ان کے پاس اس کے تمام دلائل کا ایک ہی جواب ہوتا ہے اور وہ یہ کہ **مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِیْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ** (23:24)- ہم نے اپنے اسلاف سے ایسی کوئی بات نہیں سنی۔ اور جب وحیِ خداوندی کی طرف سے اس کا یہ جواب ملتا ہے کہ **اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ** (5:104)- تو وہ عوام کے جذبات کو یہ کہہ کر مشتعل کر دیتے ہیں کہ **اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ** (26:25)- کیا تم سنتے نہیں ہو کہ یہ تمہارے اسلاف کے متعلق کیا کہتا ہے؟ نظامِ سرمایہ داری کے یہ مقدس محافظ' یہ کہہ کر عوام کے جذبات کو بھڑکاتے ہیں اور پھر' انقلاب کی آواز بلند کرنے والوں کے خلاف ہر قسم کے کذب و افتراء اور تہمت تراشی و دروغ بافی سے کام لے کر عجیب و غریب من گھڑت باتیں ان کی طرف منسوب کرتے رہتے ہیں تاکہ لوگوں کی توجہ اصل سوال کی طرف آنے ہی نہ پائے۔ خود میرے لئے یہ تجربہ بالکل نیا اور حیرت انگیز تھا۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے۔ میں نے شروع سے اس کی شدت سے احتیاط برتی ہے کہ قرآن کی اس آواز میں جو طلوعِ اسلام کی طرف سے بلند کی جا رہی ہے' کہیں فرقہ بندی اور گروہ سازی کا شائبہ تک نہ آنے پائے۔ لیکن قرآنی نظامِ ربوبیت کے مخالفین کی طرف سے سب سے پہلی آواز جو بلند ہوئی وہ یہی تھی کہ لو! اب ایک نیا فرقہ پیدا ہو گیا۔ (یعنی پرانے فرقے سب ٹھیک ہیں ان کے خلاف کوئی اعتراض نہیں۔ اتنا

ہی نہیں بلکہ ان فرقوں کے وجود کو "اسلامی" دستورِ پاکستان میں آئینی طور پر تسلیم کرایا گیا ہے۔ لیکن نیا فرقہ برداشت نہیں کیا جا سکتا؟) اب ان کے سامنے یہ سوال آیا کہ اس آواز کے بلند کرنے والوں کو فرقہ قرار کیسے دیا جائے کیونکہ یہ تو خود فرقہ پرستی کو شرک قرار دیتے تھے۔ اس کا طریق بہت آسان تھا جب انسان جھوٹ بولنے پر آجائے تو اس کے لئے کوئی بات بھی مشکل نہیں رہتی۔ آپ کو معلوم ہے کہ مختلف فرقوں کی پہچان بالعموم کس چیز سے ہوتی ہے؟ طریقِ نماز کے اختلاف سے۔ (آپ اس نقطہ پر غور کیجئے کہ قرآن نے جو کہا تھا کہ نظامِ صلوٰۃ کی وحدت سے دین کی وحدت قائم رہتی ہے یہ نہ رہے تو دین کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَلَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ مِنَ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ... (30:31)- تو یہ کتنی بڑی حقیقت کی طرف اشارہ تھا۔) بہرحال' فرقوں کی پہچان بالعموم نماز کے اختلاف سے ہوتی ہے-جب قرآنی نظام کے مخالفین نے اس کے داعیوں پر ایک فرقہ کا لیبل لگایا تو ضروری ٹھہرا کہ وہ مشہور کریں کہ ان کی نماز' باقی تمام فرقوں کی نماز سے مختلف ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ پراپیگنڈا کس انداز سے کیا جاتا ہے؟ اس کی تفصیل بڑی دلچسپ ہے۔ میں گذشتہ موسمِ گرما میں تبدیلیٔ آب و ہوا کے لئے سوات کے علاقہ میں گیا تھا۔ اس سے قبل' اس علاقہ میں میرا تعارف کہیں خال خال تھا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ میں جہاں گیا' مجھ سے دو چار روز پہلے طائرانِ پیش رس وہاں پہنچ جاتے اور لوگوں سے کہتے کہ ایک نئے فرقے کا بانی تمہارے ہاں آرہا ہے۔ ان کے ہاں تین نمازیں ہیں۔ ہر نماز میں ایک رکعت' اور ہر رکعت میں ایک سجدہ۔ اور روزے بھی ان کے ہاں نو ہی دن کے ہیں۔ چنانچہ میرے وہاں پہنچنے پر لوگ دور سے آتے اور چپکے ہی چپکے دیکھتے کہ میں نماز کس طرح پڑھتا ہوں۔ جب وہ ان سے جا کر کہتے کہ یہ تو ہماری ہی طرح نماز پڑھتا ہے' تو وہ ان سے کہتے کہ نہیں! یہ باہر والوں قسم کی نماز پڑھتا ہے اور کمرے کے اندر اور قسم کی۔ مجھے یہ باتیں ان لوگوں نے بتائیں جو آہستہ آہستہ میرے خیالات سے واقف ہو کر بعد میں میرے پاس آنے لگے۔

یہ ہے برادران! قرآنی نظامِ ربوبیت کے مخالفین کے پراپیگنڈا کی پہلی شق۔ اس کی دوسری شق اس سے بھی زیادہ شدید اور نازک ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ جب کسی مسلمان سے کہا جائے کہ فلاں شخص (خاکم بدہن) حضور رسالتؐ مآب کی شانِ اقدس میں گستاخی کرتا ہے تو وہ کس طرح آگ بھبوکا ہو جاتا ہے اور ایسا ہونا بھی چاہئے۔ وہ کون شقی القلب ہے کہ حضورؐ کی شان میں گستاخی سے اس کا خون نہ کھولنے لگ جائے (یہ الگ بات ہے کہ اس قسم کی دریدہ دہنی کا موثر علاج کیا ہے) یہ مخالفینِ نظامِ قرآنی میرے متعلق عوام میں مشہور کرتے رہتے ہیں کہ یہ شخص (معاذ اللہ) منکرِ شانِ رسالت ہے۔ یہ رسول اللہ ﷺ کو ایک ہرکارہ سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتا۔ اس کے نزدیک سیرتِ نبی اکرم ﷺ کی کچھ اہمیت نہیں۔ یہ سب کچھ اس شخص کی بابت کہا جاتا ہے جس کی سیرتِ نبویؐ پر ہزار صفحہ کی ضخیم کتاب (معراجِ انسانیت) سینکڑوں برگشتہ نوجوانوں کو شمعِ رسالت کا پروانہ بنا چکی ہے۔ اس ضمن میں ان کے پروپیگنڈے کا ایک اور نشتر یہ ہے کہ یہ شخص منکرِ حدیث ہے۔ یہ آواز آپ کو فضا میں ہر طرف پھیلی ہوئی ملے گی۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے ہاں ایک طبقہ متشددین فی الحدیث کا ہے جو کتبِ روایات کو قرآن کی مثل قرار دیتا ہے۔ ان کے نزدیک تو امام ابو حنیفہؒ بھی منکرِ حدیث تھے۔ اس لئے یہ حضرات اگر اس بناء پر کہ میرا عقیدہ ان کے عقیدہ کے مطابق کیوں نہیں مجھ پر اعتراض کریں تو مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں (بشرطیکہ وہ اس باب میں میری طرف وہی کچھ منسوب کریں جو میں کہتا ہوں) لیکن ستم ظریفی تو یہ ہے کہ میرے منکرِ حدیث ہونے کا سب سے زیادہ ڈھنڈورا وہ لوگ پیٹتے ہیں جو حدیث کے متعلق وہی کچھ کہتے ہیں جو میں کہتا ہوں۔ بلکہ ایک جہت سے اس سے بھی کچھ زیادہ وہ

رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے متعلق ایسی باتیں کہتے ہیں کہ جن کی جرأت میں کبھی نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو سب سے بڑے حدیث کے ماننے والے اور مجھے منکرِ حدیث مشہور کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ سنئے۔ کچھ عرصہ کی بات ہے۔ میرے ہاں ایک صاحب آئے اور حدیث کے متعلق باتیں کرتے کرتے کہنے لگے کہ تم رسول اللہ ﷺ کی اطاعت دائمی اور ابدی نہیں مانتے۔ تم کہتے ہو کہ حضور ﷺ کے احکام محض وقتی اطاعت کے لئے تھے۔ میں نے کہا کہ آپ پہلے یہ سن لیجئے کہ اس باب میں میرا نظریہ کیا ہے۔ اس کے بعد فرمایئے کہ آپ کا اعتراض کیا ہے (مجھے معلوم تھا کہ وہ کس جماعت سے متعلق ہیں) چنانچہ میں نے ایک کتاب اٹھائی اور اس میں سے انہیں یہ عبارت پڑھ کر سنائی :

"یہ حقیقت یقیناً ناقابلِ انکار ہے کہ شارع نے غایت درجہ کی حکمت اور کمالِ درجہ کے علم سے کام لے کر اپنے احکام کی بجا آوری کے لئے زیادہ تر ایسی ہی صورتیں تجویز کی ہیں جو تمام زمانوں اور تمام مقامات اور تمام حالات میں اس کے مقصد کو پورا کرتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بکثرت جزئیات ایسے بھی ہیں جن میں تغیرِ حالات کے لحاظ سے احکام میں تغیر ہونا ضروری ہے۔ جو حالات عہدِ رسالت اور عہدِ صحابہ میں عرب اور دنیائے اسلام کے تھے لازم نہیں کہ وہی حالات ہر زمانے اور ہر ملک کے ہوں۔ لہٰذا احکامِ اسلامی پر عمل کرنے کی جو صورتیں ان حالات میں اختیار کی گئی تھیں ان کو ہو بہو تمام زمانوں اور تمام حالات میں قائم رکھنا اور حکم کے لحاظ سے ان میں کسی قسم کا رَدّ و بدل نہ کرنا ایک طرح کی رسم پرستی ہے جس کو روحِ اسلامی سے کوئی علاقہ نہیں۔"

یہ سن کر وہ کہنے لگے کہ کیا اس عقیدہ کے بعد بھی آپ کے منکرِ حدیث ہونے میں کوئی شبہ باقی رہ سکتا ہے؟ وہ اسی سُر میں کچھ اور بھی کہنا چاہتے تھے کہ میں نے جلدی سے کتاب الٹ کر انہیں دکھائی تو اس پر لکھا تھا۔ "تفہیمات (حصہ دوم) ابو الاعلیٰ مودودی۔" اس کے بعد میں نے ان سے صرف اتنا کہا کہ یہ چیز اسی ایک شق تک ہی محدود نہیں۔ حدیث کے متعلق جو اعتراض بھی آپ مجھ پر وارد کریں میں اس کی تائید میں اسی قسم کے اقتباسات ان حضرات کی تحریروں سے آپ کے سامنے پیش کر دوں گا۔

وہ اس کے بعد کچھ کھسیانے سے ہو کر چلے گئے۔ لیکن دوسرے دن پھر حسبِ معمول ہماری مخالفت میں سرگرمِ جہاد تھے۔ یہ ہے برادران! ان حضرات کی مخالفت کی کیفیت، جو درحقیقت مخالف تو ہیں قرآنی نظامِ ربوبیت کے جس میں نہ ان حضرات کی سیادت باقی رہتی ہے نہ ان کے فتووں سے پروان چڑھنے والے سرمایہ دار طبقہ کی خون آشامیت۔ لیکن چونکہ یہ کھلے بندوں ایسا کہنے کی جرأت نہیں رکھتے اس لئے وہ ان غلط بیانیوں سے کام لے کر لوگوں کو ہم سے متنفر کرتے رہتے ہیں تاکہ وہ ہماری آواز ہی نہ سنیں۔ دکھ انہیں یہ ہے کہ ہم قرآن کا وہ نظام کیوں پیش کرتے ہیں جو سرمایہ داری کو ختم کر دیتا ہے لیکن وہ سپر ڈھونڈھتے ہیں ناموسِ رسالت اور عظمتِ اسلاف کی۔ لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں۔ قرآن بتاتا ہے کہ ان لوگوں کی طرف سے ہمیشہ یہی کچھ ہوتا رہا ہے۔ جب حضرت موسیٰؑ فرعون کے پاس گئے کہ وہ بنی اسرائیل کو اپنے پنجۂ استبداد سے رہا کر دے تو وہ بجائے اس کے کہ حضرت موسیٰؑ کی بات کا جواب دیتا اس نے ان سے کہا کہ یہ بتاؤ کہ ہمارے اسلاف کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔ مَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰی (20:51)۔ مقصد صرف یہ تھا کہ جب یہ ان کے خلاف کچھ کہیں گے تو میں فوراً عوام میں مشہور کر دوں گا کہ یہ تمہارے اسلاف کی شان میں گستاخی کرتا ہے۔ اس طرح ان کی توجہ دوسری طرف منتقل ہو جائے گی اور اصل سوال غت ربود ہو جائے گا۔ یہی کچھ شروع سے ہوتا چلا آرہا ہے اور یہی کچھ آج ہو رہا ہے۔

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی نہ حریفِ پنجہ فگن نئے
وہی فطرتِ اسد اللہی، وہی مرحبی وہی عنتری

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

علامہ غلام احمد پرویزؒ

نظامِ ربوبیّت کب اور کیسے قائم ہو گا؟

قرآنی راہنمائی زندگی کی مستقل اقدار اور اصولی حدود کی شکل میں ملتی ہے۔ یہ اقدار اور حدود غیر متبدل ہیں۔ قرآن وہ طریقے متعین نہیں کرتا جن کے مطابق ان اقدار و اصول کو ایک نظام یا معاشرہ کے محسوس پیکر میں منتقل کیا جائے گا۔ یہ طریقے حالات کے تقاضے کے مطابق، ہر دور (بلکہ ایک ہی دور کے مختلف اوقات) میں مختلف ہوں گے۔ اور عندالضرورت ان میں تغیر و تبدل ہوتا رہے گا۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن نے ان طریقوں کو خود متعین نہیں کیا۔ یہ جو ہمارے ہاں، اسلامی نظام کے سمجھنے کے سلسلہ میں اس قدر الجھنیں پیدا ہو رہی ہیں، تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ لوگوں نے، ان طریقوں کو بھی، جو کسی زمانے میں، اس وقت کی ضروریات کے مطابق حصولِ مقصد کے لئے وضع اور اختیار کئے گئے تھے، قرآنی اصول و اقدار کی طرح غیر متبدل اور ابدی سمجھ رکھا ہے، وہ طریقے اب زمانے کے بدلے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتے اور ہمارا قدامت پرست طبقہ ان میں کسی قسم کی تبدیلی کو خلافِ اسلام قرار دے دیتا ہے نتیجہ یہ ہے کہ خود اسلام کے متعلق یہ خیال عام ہو رہا ہے کہ یہ کسی زمانے میں تو خوشگوار نتائج پیدا کر گیا تھا لیکن اب اس میں زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دینے کی صلاحیت نہیں۔ لہٰذا ہمیں اس کے ساتھ چمٹے نہیں رہنا چاہئے۔

ایک قرآنی مفکر کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے دور کے مسائل پر غور کرتا اور ان کے متعلق جو قرآنی راہنمائی ملتی ہے، اسے فکری انداز سے قوم کے سامنے پیش کر دیتا ہے اور طریقِ کار ان لوگوں کے لئے چھوڑ دیتا ہے جو اس راہنمائی کے مطابق عملی عمارت استوار کرنا چاہیں۔ البتہ وہ اس باب میں اتنی احتیاط ضرور برتتا ہے کہ یہ دیکھے کہ جو عملی طریق اختیار کیا جائے وہ قرآن کے کسی اصول سے نہ ٹکرائے۔

آیئے پہلے ہم یہ دیکھیں کہ قرآنی نظام ربوبیت جب (صدر اول) میں پہلی بار عملاً متشکل ہوا تھا تو اس کی صورت کیا تھی لیکن اس سے پہلے چند الفاظ میں اسے سمجھ لیجئے کہ اس نظام کی عمارت کس بنیاد پر استوار ہوئی تھی۔ وہ سنگِ تاسیس یہ تھا کہ

ہر شخص اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق، مفوضہ امور کو نہایت محنت اور جانفشانی سے سرانجام دے، اور اس کے ماحصل میں سے، بقدر اپنی ضروریات کے لیکر، باقی سب دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کیلئے دیدے۔ بلکہ بعض حالات میں، دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر مقدم رکھے۔ اور اس کا نہ کسی سے اجر مانگے نہ معاوضہ حتیٰ کہ کسی سے شکریہ تک کا بھی متمنی نہ ہو۔

یہ تھا اس نظام کا سنگِ بنیاد جو اسلام کا مطمحِ نظر تھا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ تصور نہ صرف اس نظامِ

سرمایہ داری کے خلاف تھا جو اس زمانے میں عام تھا بلکہ خود انسان کی طبعی زندگی کے جبلی تقاضا کے بھی خلاف۔ انسان کی طبعی زندگی کا جبلی تقاضا مفادِ خویش کا تحفظ ہے۔ اسے کسی دوسرے کے مفاد کی کوئی فکر اور پرواہ نہیں ہوتی۔ اس لئے جو تقاضا' قرآنی نظام کا سنگِ بنیاد قرار پاتا ہے' وہ اسے اس کے جبلی تقاضوں سے بلند لے جاتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ (حیوانی سطح پر زندگی بسر کرنے والے) عام انسانوں کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے خاص انداز کے انسان کی ضرورت ہے اور انسانیت سازی درحقیقت قرآنی تعلیم کا مقصود ہے۔ اسی داخلی انقلاب سے وہ جذبۂ محرکہ پیدا ہوتا ہے جس سے انسان اتنے بڑے ایثار کیلئے بطیب خاطر تیار ہو سکتا ہے۔ اس نظام کی تشکیل کیلئے جب نبی اکرمؐ نے اپنی دعوت کا آغاز کیا تو اس وقت (حضورؐ کے سوا) دنیا میں کوئی مسلمان نہیں تھا۔ آپؐ نے اس نظامِ نو کے اصول و اقدار اپنی قوم کے سامنے پیش کئے اور پیش کرتے چلے گئے۔ قوم نے اس دعوت کی مخالفت کی لیکن ان میں ایسے افراد بھی تھے جنہوں نے اس پر سکون و اطمینان سے غور و فکر کیا اور اس کے بعد' جب وہ اس کی صداقت کے متعلق دل اور دماغ کی کامل رضا مندی سے مطمئن ہو گئے تو انہوں نے اسے قبول کرنے کا اقرار کیا اور اس طرح اس سوسائٹی کے ممبر بن گئے جس کی طرف حضورؐ دعوت دیتے تھے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ اس زمانے میں وہی لوگ مسلمان کہلاتے تھے جو اپنے قلب و دماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ' اس نظام کی صداقت کے قائل ہو چکے تھے۔

جو لوگ اس طرح اس سوسائٹی کے ممبر بنتے تھے ان کی تعلیم و تربیت کا خصوصی انتظام خود نبی اکرمؐ فرماتے تھے **یعلمھم الکتاب و الحکمۃ ویزکیھم** یعنی حضورﷺ انہیں اس نظام کے قوانین و ضوابط کی تعلیم دیتے تھے۔ اس کی حکمت و غایت سے آگاہ کرتے تھے اور اس طرح ان کی صلاحیتوں کی نشوونما کرتے چلے جاتے تھے۔ "صلاحیتوں کی اس نشوونما" سے مراد صرف ذہنی صلاحیتیں نہیں اس سے مفہوم ان صلاحیتوں کی نشوارتقاء بھی ہے جن کی بنیادوں پر انسانی سیرت و کردار کی بلند و بالا عمارت استوار ہوتی ہے۔ اسے انسانی ذات کی نشوونما کہا جاتا ہے۔ اور یہی چیز جذبۂ محرکہ بنتی ہے اس عظیم ایثار کا جس پر اس نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ جب ان میں سیرت و کردار کی اس قسم کی پاکیزگی اور پختگی پیدا ہو جاتی تھی تو ان سے ایک عہد لیا جاتا تھا جو درحقیقت اسلامی نظامِ ربوبیت کی اصل و اساس ہے یعنی یہ عہد کہ

"یہ حقیقت ہے (یونہی ذہنی عقیدت مندی نہیں) کہ مومنین نے اپنا مال اور اپنی جان خدا کے ہاتھوں فروخت کر دیئے ہیں اور خدا نے انہیں جنت کے عوض خرید لیا ہے" (9/111)

اسی جماعت کے افراد کو مومن کہا جاتا تھا یعنی وہ لوگ

1- جنہوں نے سوچ سمجھ کر اور دیکھ بھال کر' برضا و رغبت' اس نظام کی صداقت کو قبول کیا۔

2- ان کی تعلیم و تربیت خود رسولؐ اللہ نے فرمائی اور اس طرح ان کے قلب و نگاہ میں قرآنی اقدار کے مطابق انقلاب پیدا ہوتا چلا گیا۔

3- انہوں نے اپنی جان اور مال اسی نظام کے ہاتھ فروخت کر دیا۔

رسولؐ اللہ کی مکی زندگی پوری کی پوری اسی عملِ تزمیل (جماعت سازی) میں بسر ہو گئی اور تیرہ سال کے عرصہ میں جو افراد اس سوسائٹی کے رکن بنے ان کی تعداد چند سو سے زیادہ نہ تھی۔ جو حضرات' بنیادی نظریات کی تبلیغ کے مرحلہ کو "بے عملی" سے تعبیر کرتے ہیں' اور عمل کا تصور ان کے ہاں ہنگامہ خیزی اور شورش انگیزی ہوتا ہے ان کے نزدیک حضورؐ کی یہ تیرہ

سالہ زندگی تو "بے عملی" کا دور کہلائے گی!

اس جماعتِ مومنین کی مکی زندگی ایک اور اہم حقیقت کی بھی پردہ کشا ہے۔ لوٹ مار، جنگ و جدال، فتنہ و فساد عربوں کی گھٹی میں پڑا تھا اور اس جماعتِ نو کے افراد پر ہر قسم کے مظالم ہوئے لیکن ان میں سے کسی نے نہ کسی قسم کا دنگا فساد کیا، نہ لڑائی جھگڑا، نہ کہیں پتھراؤ کیا نہ گھیراؤ حتیٰ کہ نہ کہیں جھوٹ بولا نہ کسی کو فریب دیا۔ نہ کسی سے بدمعاملگی کی، نہ کسی قسم کی عہد شکنی۔ تکلیفیں برداشت کرتے رہے لیکن فریقِ مقابل کے خلاف نہ جھوٹا پراپیگنڈہ کیا نہ کسی قسم کی غلط بیانی سے کام لیا۔ نہ کوئی سازش کی، نہ زمین دوز تحریک چلائی، جو کچھ کہا کھلے بندوں کہا۔ جو کچھ کیا علی الاعلان کیا۔ اپنے کام سے کام رکھا۔ اور جب دیکھا کہ مکہ کے مقابلہ میں مدینہ کی فضا، اس نظام کے قیام کیلئے زیادہ سازگار ہے تو نہایت خاموشی سے ہجرت کر کے وہاں چلے گئے اور جاتے وقت بھی نہ کسی کو کسی قسم کا دھوکا دیا، نہ خیانت کی۔ مدینہ گئے تو وہاں کسی سے حکومت نہیں چھینی۔ نہ ہی ایسا ہوا کہ کوئی بنی بنائی حکومت کسی نے ان کے حوالے کر دی ہو۔ وہاں انہوں نے اپنی مملکت قائم کی۔۔۔۔ "مملکت قائم کی" کے الفاظ ذرا وضاحت طلب ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ مملکت قائم کس طرح سے کی گئی تھی۔ اس کے لئے طریقِ کار کیا اختیار کیا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں قرآن پھر ایک اُصول بیان کرتا ہے اور وہ اُصول ایسا جامع ہے جس میں تمام تفاصیل خود بخود سمٹ کر آجاتی ہیں سورۃ النور میں ہے "یہ مملکت نہ کسی سے چھین جھپٹ کر لی گئی تھی نہ کسی نے بطور بخشائش ہبہ کر دی تھی۔ یہ فطری نتیجہ تھی ان کے ایمان اور اعمالِ صالح کا (24/55)۔ ایمان۔ یعنی اپنے نصب العین کی صداقت پر یقینِ محکم اور اعمالِ صالحہ۔ قرآنی اقدار و اُصول کے اندر رہتے ہوئے وقت اور محل کے مطابق مناسب اقدامات (واضح رہے کہ قرآن نے "اعمالِ صالح" پر اتنا زور دیا لیکن ان اعمال کی کوئی جامع و مانع فہرست مرتب کر کے نہیں دی۔ حتیٰ کہ اس نے "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کو جماعتِ مومنین اور مملکتِ اسلامیہ کا بنیادی فریضہ قرار دیا ہے لیکن (بجز چند احکام) معروف و منکر کی تفاصیل بھی خود متعین نہیں کیں)

جب یہ جماعت صاحبِ اقتدار ہو گئی۔ یعنی وسائلِ رزق ان کے قبضہ میں آگئے تو معاشرہ میں نظامِ ربوبیت خود بخود نافذ ہو گیا۔ بالفاظِ دیگر یوں کہئے کہ یہ کاروان، مختلف وادیوں میں سے گزرنے کے بعد، اپنی منزلِ مقصود تک جا پہنچا۔ اس وقت نہ کسی نے یہ سوال اٹھایا کہ مملکت تو مل گئی ہے، اب اس میں کس قسم کا نظام قائم کیا جائے نہ یہ تنازعہ پیدا ہوا کہ فلاں قسم کا معاشی نظام اسلامی ہے یا غیر اسلامی۔ انہوں نے چلنے سے پہلے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ہم نے پہنچنا کہاں ہے۔ اس لئے منزل پر پہنچنے کے بعد کسی کے دل میں یہ سوال نہ ابھرا کہ یہ ہماری منزلِ مقصود ہے یا نہیں۔ ان میں سے ہر فرد جو اس سوسائٹی کا ممبر بنا تھا، سب کچھ دیکھ بھال، سوچ سمجھ کر، ممبر بنا تھا۔ ان میں سے ہر ایک کو معلوم تھا۔ اور حتمی اور یقینی طور پر معلوم کہ اس سوسائٹی کا مقصود و منتہیٰ کیا ہے اور اس مقصد کے حصول کیلئے ہمارا فریضہ کیا۔ یہ افراد اس سوسائٹی کا ممبر بننے کے بعد، اپنے آپ کو، اس مقصد کے حصول کیلئے تیار کرنے، اور اس کے اہل بننے میں مصروف رہے۔ جب انہوں نے اپنے اندر اس کی اہلیت پیدا کر لی تو مقصد حاصل ہو گیا۔ یعنی اسلامی نظام قائم ہو گیا۔ اس کے بعد یہ لوگ اس نظام کے استحکام و فروغ اور اندرونی اور بیرونی خطرات سے اس کی حفاظت و مدافعت کیلئے مصروفِ جدوجہد رہے۔ یہ ہے وہ "طریق" جس کے مطابق صدرِ اوّل میں یہ نظام قائم ہوا۔

اب آپ تاریخ کے اوراق کو چودہ سو سال آگے

الٹ کر' پاکستان کی طرف آجایئے۔ یہاں ایک ایسی قوم بستی ہے جو مسلمان کے نام سے متعارف تو ہے لیکن

(1) ان میں سے نہ کسی نے' اسلام کو سوچ سمجھ کر اور دیکھ بھال کر دل اور دماغ کے کامل اطمینان کے ساتھ' بطیب خاطر اختیار کیا ہے۔

(2) نہ ہی ان کے سامنے اسلام کا کوئی واضح اور متعین مفہوم ہے۔

(3) نہ ہی انہیں حتمی طور پر معلوم ہے کہ اسلامی نظام کسے کہتے ہیں اور اس کا مقصود و منتہٰی کیا ہے اور جو اسلام ان کے ہاں مروج ہے۔ وہ' وہ مذہب ہے جو انفرادی اور گروہی مفادات کے تحفظ کیلئے ہمارے دورِ ملوکیت میں وضع کیا گیا۔

(4) نہ ہی (صدرِ اوّل کے مسلمانوں کی طرح) ان کی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام ہوا ہے۔

(5) نہ ہی انہوں نے اپنے مقصد کے حصول کیلئے اپنی جان اور مال کو کسی کے ہاتھ فروخت کر دینے کا معاہدہ کیا ہے اور

(6) نہ ہی یہ مملکت انہیں' ان کے ایمان و اعمالِ صالح کے نتیجہ میں ملی ہے۔

یہاں حالت یہ ہے کہ :

(1) یہ قوم' متفق علیہ طور پر اتنا بھی نہیں بتا سکتی کہ مسلمان کہتے کسے ہیں۔

(2) کوئی معاملہ پیش آئے ایک گروہ اسے اسلامی قرار دیتا ہے اور دوسرا غیر اسلامی' کوئی اسے جائز ٹھہراتا ہے کوئی ناجائز۔ ذرا ذرا سی بات پر ان میں باہمی سر پھٹول ہوتی ہے۔ اور کفر کے فتوے صادر ہوتے ہیں۔ اور کوئی اتھارٹی ایسی نہیں جسے متنازعہ فیہ معاملات میں حکم تسلیم کیا جاتا ہو۔

اور حکومتوں کی صورت یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کی کوشش یہ رہی کہ مملکت کا نام اسلامی رکھ کر اور آئین میں یہ شق داخل کر کے کہ ملک کا کوئی قانون اسلام (یا کتاب و سنت) کے خلاف نہیں ہو گا' ملّا سے جان چھڑاؤ اور عوام میں سستی شہرت حاصل کرو۔

یہ ہے یہاں کی مسلمان قوم اور یہ ہیں اس قوم اور ملک کے حالات اور اس کے بعد مجھ سے پوچھا جاتا ہے کہ (تم نے قرآن پر غور کیا ہے) تم بتاؤ کہ (اس قوم میں کسی قسم کی تبدیلی کئے بغیر) یہاں قرآن کا معاشی نظام (نظامِ ربوبیت) کس طرح نافذ کیا جائے؟

نظامِ ربوبیت' کوئی خود کار مشین نہیں' جسے کہیں سے امپورٹ کر کے یہاں نصب کر دیا جائے اور سوئچ دبا دینے سے وہ چلنے لگ جائے۔ نظامِ ربوبیت' دل کی گہرائیوں سے ابھرنے والی امنگوں کے محسوس پیکر کا نام ہے۔ اور یہ کسی ایسی قوم میں نفاذ پذیر نہیں ہو سکتا جس کے اعماقِ قلب میں اس قسم کی تبدیلی نہ پیدا ہوئی ہو۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں اس حقیقت کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ ہم مسلمان اگر قلب و نگاہ کی تبدیلی سے مسلمان نہیں ہوئے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ میں موجودہ مسلمانوں کی قومی (اجتماعی) زندگی کو بیکار سمجھتا ہوں۔ بالکل نہیں جب کوئی قوم اقدار (یا آئیڈیالوجی) کے اشتراک کی بنا پر اپنی اجتماعیت سے محروم ہو جائے لیکن وہ اس کے باوجود انفرادی زندگی کے بجائے اجتماعی زندگی بسر کرنا چاہے تو اس کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنی وجہِ تعارف کو اپنی اجتماعیت کی بنیاد قرار دے اور اس طرح اپنے افراد کو تنکوں کی طرح منتشر ہونے سے بچا لے۔ اس قسم کی اجتماعی زندگی انفرادی زندگی سے بہرحال بہتر ہوتی ہے بشرطیکہ اس سے' دوسروں کے خلاف نفرت کے جذبات اور سلب و نہب کی ہوس نہ ابھرے۔ میں نے تقسیمِ ہند سے پہلے' مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ کے برقرار رکھنے اور اسے مستحکم کرنے کیلئے (اپنی بساط کے مطابق) جو کچھ کیا اس کا جذبہ محرکہ یہ تھا کہ قوم کی اس ہیئت کو بہرحال قائم رکھا جائے تاکہ اس اجتماعیت سے اگر ہمیں ایک

آزاد خطہ زمین حاصل ہو جائے تو اس میں قرآنی نظام کا امکان ہو۔ ہندوستان کا ایک جزو رہتے ہوئے اس کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔

اور تقسیم ہند کے بعد' میں نے اس امکان کو مشہود بنانے کیلئے جدوجہد شروع کر دی۔ اس کے لئے کرنے کا کام یہ تھا کہ بقول اقبالؒ اس "مسلماں نا مسلمانے" کو مسلمان بنا دیا جائے۔

زباں نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں!

میں نے اس کے لئے' سنتِ رسول اللہ ﷺ کے اِتباع میں' طریقہ وہی اختیار کیا جسے حضور ﷺ نے اپنی دعوت کے آغاز میں اختیار فرمایا تھا یعنی میں نے

1- سب سے پہلے اپنی قوم سے کہا کہ ہمارا مروّجہ اسلام دین نہیں رہا مذہب میں تبدیل ہو چکا ہے اسے جب تک دین میں تبدیل نہ کیا جائے گا مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہوں گے۔ میرے ہزاروں مضامین' تقریریں' درس سب اسی مقصد کیلئے تھے۔ پہلے دین اور مذہب کا فرق کر کے بتایا پھر مثبت طور پر دین کا قرآنی تصور قوم کے سامنے پیش کیا۔ اس کے ساتھ ہی جو اہم معاملہ قوم کے سامنے آیا اس کے متعلق وضاحت سے بتایا کہ قرآن اس باب میں کیا راہنمائی دیتا ہے۔

2- میں نے اربابِ بست و کشاد اور اصحابِ فکر و نظر سے کہا کہ موجودہ مسلمانوں سے (جیسے کچھ بھی ہم ہیں) مملکتِ پاکستان کو محفوظ رکھنے اور مستحکم بنانے کا کام لیا جائے' لیکن ہماری نئی نسلوں کی تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام کیا جائے جس سے ان کے قلب و نگاہ میں وہ تبدیلی پیدا ہو جائے جسے ایمان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ ہو گی وہ قوم جسے صحیح معنوں میں "ملت اسلامیہ" کہہ کر پکارا جائے گا۔ اس ملت کے وجود میں آ جانے سے اسلامی معاشرہ وجود میں آجائیگا اور انہی کے قلوب سے ابھرنیوالی امنگوں سے نظامِ ربوبیت قائم ہو گا۔ اس کے لئے عملی طریق کیا اختیار کیا جائے گا' اسے وہ ملت' اس وقت کے حالات کے مطابق' خود طے کرے گی۔ یہ ہے اسلامی نظام قائم کرنے کا وہ طریقہ جسے میں اپنی قرآنی بصیرت کے مطابق سمجھ سکا ہوں' اور جسے منہاجِ رسالت پر تدبر و تفکر کے بعد میں نے (اپنی استعداد کے مطابق) اختیار کر رکھا ہے۔ میرا اولین مخاطب' تعلیم یافتہ اور برسرِ اقتدار طبقہ ہوتا ہے کہ اگر بات ان کی سمجھ میں آجائے اور وہ اس قرآنی مشن کو پورا کرنے کیلئے آمادہ ہو جائیں تو اس نظام کے قائم ہونے میں نہ دیر لگ سکتی ہے نہ دقت پیش آسکتی ہے۔ ہمارے پیشِ نظر آئین ہے اور مملکت کے نظام میں تبدیلی آئینی طور پر ہی پیدا کی جا سکتی ہے۔ اس کے لئے دوسری صورت یہ ہے کہ اس تصور کو ملک میں اس قدر عام کیا جائے کہ یہ جمہور کا تقاضا بن جائے اور وہ ایسے افراد کو اپنا نمائندہ منتخب کر کے مجالسِ قانون ساز میں بھیجیں جو اس نظامِ خداوندی کی صداقت پر علیٰ وجہ البصیرت ایمان رکھتے ہوں اور اسے عملاً متشکل کرنے کا عزم لے کر ان مجالس میں جائیں۔

حضور اکرم ﷺ نے تبلیغِ دین کے ساتھ' ایک الگ جماعت (امت) کی تشکیل بھی فرمائی تھی لیکن میں نے الگ جماعت سازی سے سخت اجتناب کیا ہے' اور اپنے آپ کو صرف ایک مبلغ کی حیثیت سے محدود رکھا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک رسول اپنے پیغام کے نہ ماننے والوں کو کافر قرار دیتا ہے اور جو لوگ اس پیغام کی صداقت کو قبول کر لیتے ہیں' انہیں ان کفار سے الگ کر کے ایک متمیز امت کی تشکیل کرتا ہے لیکن میرے سامنے پوری امت محمدیہ ﷺ دنیا کے جملہ غیر مسلموں (کفار) کے مقابلہ میں' ایک جماعت ہے۔ اس لئے اس امت کے اندر' کافر و مسلم کی تفریق کا تصور بھی میرے نزدیک معصیتِ کبریٰ اور جرمِ عظیم ہے۔ امت محمدیہ ﷺ کے اندر کافر و مسلم کی تفریق تو ایک

طرف' قرآن کریم اس امت کے اندر فرقہ بندی کو بھی شرک قرار دیتا ہے (30/31) اور رسولؐ اللہ سے کہتا ہے کہ ایسا کرنے والوں کے ساتھ تمہارا کوئی تعلق نہیں رہیگا (6/16) اس لئے میں ایک الگ جماعت بنانے کی جرأت کیسے کر سکتا ہوں۔ میں دین کے تصورات کو عام کئے جا رہا ہوں اور جو لوگ ان تصورات سے متفق ہو جاتے ہیں ان سے کہتا ہوں کہ وہ بھی اسی طرح انہیں عام کرتے چلے جائیں تاکہ ہماری پوری قوم کے سامنے دین کے صحیح تصورات آجائیں۔ اسی طرح جب میں قوم کی نئی نسل کیلئے قرآنی تعلیم و تربیت پر زور دیتا ہوں تو اس سے مراد کسی خاص گروہ یا طبقے کے بچوں کیلئے نہیں بلکہ پوری قوم کے بچوں کیلئے ہوتی ہے۔

اس سلسلہ میں مجھ سے اکثر کہا جاتا ہے کہ جس منزل کی تم نے نشاندہی کی ہے اس سے تو ہم متفق ہیں لیکن اس تک پہنچنے کیلئے جو راستہ تم تجویز کرتے ہو وہ بہت لمبا ہے اور زمانہ آج بڑی تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہا ہے اس لئے اس کے لئے کوئی (Short Cut) ہونا چاہئے۔

یہ اعتراض (بظاہر) بڑا وزنی دکھائی دیتا ہے اور میں نے دیکھا ہے کہ اکثر عجلت پسند طبائع اس سے متاثر بھی ہو جاتی ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ قرآن کریم (یا اسوۂ رسولؐ اللہ سے مجھے کوئی (Short Cut) ملتا نہیں۔ حضورؐ اکرم کی مکی زندگی کے تبلیغی مرحلہ کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔

قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اس محنتِ شاقہ سے کاشت کردہ کھیتی کو اپنے سامنے برومند ہوتا دیکھنے کی آرزو خود حضورؐ کے دل میں بھی بیدار ہوتی لیکن بارگاہِ خداوندی سے جواب ملتا کہ "جو کچھ ان لوگوں سے کہا جاتا ہے اگر اس کا کچھ حصہ تیری زندگی میں سامنے آجائے یا تو اس سے قبل وفات پا جائے تو اس سے تیرے پروگرام پر کچھ اثر نہیں پڑنا چاہئے۔ تیرا کام یہ ہے کہ تو اس پیغام کو لوگوں تک پہنچائے چلا جا۔ یہ دیکھنا ہمارا کام ہے کہ ہمارے قانونِ مکافات کی رو سے اس کے محسوس نتائج کب سامنے آتے ہیں" (13/40)

آپ نے غور فرمایا کہ داعیٔ انقلاب کی اس حسین و معصوم آرزو کے باوجود کوئی چھوٹا متبادل راستہ تجویز نہیں کر دیا گیا۔ "تبلیغ" کا وہی طول طویل پروگرام برقرار رکھا گیا اور اسی پر مستقل مزاجی سے عمل پیرا رہنے کی تاکید کی گئی۔ جب راستے کی طوالت کو حضور رسالتمآب کیلئے بھی مختصر نہیں کیا گیا تو ہم آپ کس قطار شمار میں ہیں۔ خدا کے مقرر کردہ قوانین اٹل ہیں اور ان میں کسی کی خاطر بھی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔

لہٰذا' ہمارے لئے دو ہی راستے ہیں۔ اگر ہم نے قرآن کی متعین کردہ منزل تک پہنچنا ہے۔۔ یعنی اپنے ہاں قرآنی نظامِ ربوبیت نافذ کرنا ہے تو اس کیلئے پروگرام بھی وہی اختیار کرنا ہو گا جسے قرآن نے تجویز کیا ہے۔ یعنی قلب و نگاہ کی تبدیلی سے "مسلماں نا مسلمانے" کو مسلمان بنانا تاکہ وہ نظام اس کے ایمان و اعمالِ صالح کے فطری نتیجہ کے طور پر منشکل ہو سکے۔ اس راستے کو قرآن نے العقبۃ' سے تعبیر کیا ہے یعنی پہاڑ کی گھاٹی پر چڑھنا۔۔ پہاڑ کی گھاٹی پر تیز چڑھا ہی نہیں جا سکتا۔

ویسے اگر کوئی ہنگامی طور پر قرآن کے معاشی نظام کو یہاں نافذ کرنا چاہتا ہے تو اسے حکومت قانوناً" نافذ کر سکتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مفاد پرست گروہ اسے جبر سے تعبیر کریگا لیکن قانوناً" اسے جبر نہیں کہا جا سکے گا۔ اس لئے کہ جب مسلمان' قرآن پر ایمان رکھنے کا اقرار کرتے ہیں تو قرآن کے کسی حکم کی اطاعت کو وہ جبر کس طرح کہہ سکتے ہیں؟ لیکن یہ محض ایک ہنگامی اور وقتی تدبیر ہو گی اسے نہ دوام و ثبات حاصل ہو سکے گا اور نہ ہی دیانتدارانہ طور پر اس پر عمل ہو گا۔ دیانتدارانہ عمل اسی قانون پر ہو سکتا ہے جس کا تقاضا انسان کے دل سے ابھرے۔ خارج سے وارد کردہ

قوانین کی اطاعت طوعاً و کرہاً ہی کی جا سکتی ہے۔ اور جن لوگوں کے مفاد پر اس سے زد پڑتی ہو وہ ہر وقت اس سے گریز کی راہیں تلاش کرنے یا تراشنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ اسے دوام و ثبات اسی صورت میں حاصل ہو سکے گا جب یہ اس قوم کے ہاتھوں منشکل ہو گا جس کے قلب و دماغ میں تبدیلی آچکی ہو جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ اس کا بھی انتظام کرے کہ ان کی آنے والی نسلوں کی ذہنیت بھی قرآنی سانچوں میں ڈھلتی رہے (جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں)

قلب و دماغ میں اس قسم کی تبدیلی پیدا کرنے کیلئے تو یقیناً وقت لگے گا اور اس مدت کو ہمیں ہمت اور حوصلہ سے برداشت کرنا پڑیگا۔ لیکن اگر ہم اتنے لمبے وقت کا انتظار نہیں کر سکتے تو پھر ہمیں قرآنی منزل کو اپنے سامنے رکھنا ہی نہیں چاہئے سیدھے طور پر اپنی منزل آپ متعین کر لینی چاہئے اور اس تک پہنچنے کے راستے بھی خود ہی تجویز کر لینے چاہئیں لیکن پھر دیانتداری کا تقاضا ہے کہ ہم اس پر اسلام کا لیبل نہ لگائیں۔

میں قرآن کے اسی انقلاب کا مبلغ ہوں اور اس کیلئے اسی کے تجویز کردہ راستہ پر گامزن۔۔۔ جو احباب مجھ سے کسی اور طریق کے متقاضی اور متمنی ہیں میں ان کی خدمت میں اس سے زیادہ اور کیا عرض کر سکتا ہوں کہ

زما نگاہ طلب' کیما چہ می جوئی!

بعض احباب کہتے ہیں کہ جس منزل کی تم نے نشاندہی کی ہے' وہ بھی درست ہے' اور اس تک پہنچنے کا جو طریق تم تجویز کرتے ہو ہمیں اس سے بھی اتفاق ہے لیکن تم نے اپنا مخاطب تعلیم یافتہ طبقہ قرار دے رکھا ہے حالانکہ موجودہ غلط معاشرہ میں سب سے بری حالت عوام کی ہے اس لئے تمہیں چاہئے کہ عوام میں جا کر اپنے پیغام کی تبلیغ کرو۔ انقلاب عوام کے لانے سے آئے گا۔

ان حضرات سے میں عرض کرونگا کہ جب بات آپ کے سامنے اس قدر واضح طور پر آچکی ہے تو پھر آپ اٹھ کر اس کے مطابق کام کیوں نہیں کرتے؟ آپ مجھ سے تقاضا کیوں کرتے ہیں کہ میں اپنا اختیار کردہ پروگرام ترک کر کے' اس پروگرام کو اختیار کروں جسے آپ بہتر قرار دیتے ہیں۔ ایک مامور من اللہ (رسول) کی تو یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اس کی زندگی میں کوئی دوسرا کسی متبادل راستے کو اختیار نہیں کر سکتا لیکن میں تو نہ مامور من اللہ ہوں اور نہ ہی میں نے اس انقلاب آفرینی کا اجارہ لے رکھا ہے۔ میں نے بطیب خاطر اپنے لئے زندگی کا ایک مشن تجویز اور اختیار کر رکھا ہے اور اسی میں گامزن ہوں۔ جو احباب میرے اس مشن کے ساتھ اتفاق کر کے میرے رفیق سفر بنتے ہیں' میں ان کی رفاقت کو شکریہ کیساتھ قبول کرتا ہوں جنہیں اس سے اختلاف ہوتا ہے ان سے بصد معذرت عرض کر دیتا ہوں کہ آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں اور اپنے لئے جونسا راستہ بہتر خیال کریں اسے اختیار کر لیں۔ اب آپ سوچئے کہ جو حضرات اس کے باوجود یہ اعتراض کئے جائیں کہ تم ہمارا تجویز کردہ راستہ کیوں اختیار نہیں کرتے' میں انہیں کیا جواب دوں۔ میرا تجربہ تو یہ ہے کہ اس قسم کے اعتراضات وہی لوگ کرتے ہیں جو خود کوئی تعمیری کام نہیں کر سکتے اور دوسروں کی تنقیص و تنکیر سے اپنے آپ کو اِس خود فریبی میں مبتلا رکھتے ہیں کہ ہم بہت بڑا کارنامہ سرانجام دے رہے ہیں۔ کام کرنے والا اگر کسی راستے کو غلط سمجھتا ہے تو اسے چھوڑ کر کسی دوسرے راستے پر گامزن ہو جاتا ہے۔ وہ یہ نہیں کرتا کہ خود ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائے اور دوسروں کے پروگرام میں نقص نکال کر عمر بھر یہ شکایت کرتا رہے کہ وہ اس کے تجویز کردہ راستے کو کیوں اختیار نہیں کرتے۔

یہ ہے میرا مسلک جس پر میں کاربند چلا آرہا ہوں اور کاربند رہنا چاہتا ہوں کیونکہ میں اپنی قرآنی بصیرت کے مطابق اسی کو صحیح سمجھتا ہوں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

منافقت

دورِ حاضر کی میکیاوَلی سیاست کا طرۂ امتیاز منافقت ہے جو فرد یا گروہ منافقت کو خوبصورتی سے نباہ سکتا ہے وہی سب سے زیادہ کامیاب ہے۔ ہمارے ہاں یہ منافقت اگرچہ زندگی کے تمام شعبوں پر چھائی ہوئی ہے لیکن یک گوشہ ایسا ہے جہاں یہ ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ آپ اپنے ہاں کے لیڈروں سے تنہائی میں ملئے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ مُلّا کو گالیاں دیں گے۔ ان کا موضوعِ سخن ہی یہ ہو گا کہ اس طبقہ نے قوم کو تباہ و برباد کر دیا ہے یہ ہمیں ہزار سال پیچھے لیجانا چاہتے ہیں۔ ان کی ہر ت میں دقیا نوسیت اور ہر تجویز میں رجعت پسندانہ سلک جھلک رہا ہوتا ہے۔ یہ بہروپئے طرح طرح کے بھیس بدل کر جہلاء کو اپنے دامِ فریب میں مبتلا رکھتے ہیں اور اس طرح اپنا اُلّو سیدھا کرتے رہتے ہیں۔ وغیرہ غیرہ۔ ہر خلوت میں ان کا انداز یہی ہو گا۔ لیکن یہ پنے ہر اجتماع اور ہر تقریب میں انہی مولویوں کو دعوت یں گے۔ ان سے گہری عقیدت مندی کا اظہار کریں لے۔ ان سے گھل مل کر باتیں ہوں گی جن میں کہا ئے گا کہ آپ کی پیشوائیت کے بغیر ہماری نجات ہی یں ہو سکتی۔

دوسری طرف ان مولوی صاحبان کی یہ حالت ہے کہ یہ اپنی مجلسوں میں ان لیڈروں کو گالیاں دیں گے۔ انہیں فاسق و فاجر قرار دیں گے۔ ان کے شراب کے پیالوں کو بڑھ بڑھ کر اچھالیں گے اور ان کے رقص و سرود کی محفلوں کو عریاں کریں گے۔ لیکن ان اجتماعات میں ان سے گرمجوشی سے مصافحہ کریں گے۔ ان کے پہلو میں بیٹھنے کی کوشش کریں گے اور کیمرے والے کی طرف اس زاویئے سے کھڑے ہوں گے جس سے ہر تصویر دیکھنے والے کو معلوم ہو جائے کہ یہ کون بزرگ ہیں جن سے صدر مملکت اس تپاک سے مل رہے ہیں اور وزیراعظم اس انہماک سے مصروفِ گفتگو ہیں۔ دونوں جانتے ہیں کہ یہ منافقت ہے لیکن دونوں قوم کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ (2:9)..... یہ غیر شعوری طور پر خود اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں اور دل میں خوش ہوتے ہیں کہ اسے کوئی نہیں سمجھتا۔ حالانکہ جنہیں خدا نے آنکھیں دی ہیں انہیں صاف نظر آرہا ہوتا ہے کہ

دونوں کے دل میں چور ہے، بیٹھے ہیں سامنے
وہ دل لئے ہوئے یہ تمنا لئے ہوئے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایاز حسین انصاری (کراچی)

توہینِ رسالت

(اسباب و علل)

عیسائیت نے دنیا کو یہ تاثر دیا ہے کہ
یہ سرتاپا محبت کا مذہب ہے۔
خدا محبت ہے۔ (God is Love)
خدا رحم ہے۔ (God is Mercy)
خدا کا حکم ہے کہ اپنے دشمن سے محبت کرو۔ (Love Thy Enemy)
یہاں تک کہ کوئی ایک گال پر تھپڑ رسید کرے تو بات نہ بڑھاؤ۔ دوسرا گال اس کے سامنے کر دو۔

بظاہر یہ تعلیم بڑی خوش آئند ہے اور سادہ لوح انسان اس سے بہت جلد متاثر ہو جاتے ہیں لیکن آیئے دیکھتے کہ خود مغربی مفکر اس باب میں کیا کہتے ہیں۔

1- ولیم اے برینڈ (William A Brend)
انجیل کا یہ حکم کہ دشمن سے محبت کرو ایک ایسا مطالبہ ہے جو نفسیاتی ناممکنات میں سے ہے۔
(Foundations of Human Conflicts. P.37)

2- وہائٹ ہیڈ
انجیل میں جس قسم کا اخلاقی ضابطہ دیا گیا ہے اگر اسے موجودہ زمانے میں نافذ کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ فوری موت کے سوا کچھ نہ ہو۔

3- پروفیسر جوڈ
مسیحیت کی رو سے زندگی کا مسکن یہ دنیا نہیں بلکہ آنے والی دنیا ہے۔ اس کے نزدیک یہ دنیا شر اور فساد کی دنیا ہے۔ اس میں کوئی شے خیر کی نہیں۔
(Guide to Philosophy of Religion and Politics. P.127)

4- پروفیسر ڈاکٹر فالٹا (Prof. Dr. Falta)
مسیحیت میں عدل کا تصور بھی اسی طرح ناپید ہے جس طرح ذہنی دیانت کا۔ مسیحیت نے ان لوگوں

سے تو شفقت اور ہمدردی کا اظہار کیا جن پر ظلم و ستم ہوا لیکن خود ظلم و ستم سے ہمیشہ چشم پوشی کی۔ اس نے ان لوگوں کو جو ظلم و استبداد کے نیچے دبے ہوں محبت کی تعلیم دی اور رحم کا سبق تو سکھایا لیکن ان کے لئے عدل و انصاف کا اہتمام نہ کیا۔ سینٹ ونسنٹ فرانس کے اس قید خانے کا معائنہ کرتا ہے جو دنیا کا جیتا جاگتا جہنم ہے۔ وہ وہاں محبت کا پیغام عام کرتا ہے اور گنہگاروں کو توبہ کی تلقین کرتا ہے لیکن اس ظلم و استبداد کا اسے احساس تک نہیں ہوتا جس پر اس جہنم کا قیام ہے۔ عدل و انصاف اور حق و باطل کی طرف سے مسیحیت کی روح یکسر بے حس ہے۔

(Quoted by Briffault in The Making of Humanity. Pages. 332-333)

آر سی جانسٹن (R.C. Johonston)

ازلی گناہ کا عقیدہ دراصل ازلی خرابی ہے اس کی وجہ سے ہم ہر قسم کے خیر سے بیزار اور ہر قسم کے شر کی طرف مائل رہتے ہیں۔ (Confucianism of Modern China)

ڈورسی (Dorsey)

آج لاکھوں انسانوں کے نزدیک عیسائیت شکست خوردوں کا مذہب ہے۔ وہ اس مذہب کی قبولیت سے اعترافِ شکست کرتے ہیں۔ یہاں کوئی شے قابلِ اطمینان نہیں۔ اس میں اطمینان کی آرزو باطل اور آرزو کی تکمیل گناہ ہے۔ یہ اندازِ نگاہ صحیح اور تندرست زندگی کو ناممکن بنا دیتا ہے اور اس سے انسانیت تباہ ہو جاتی ہے۔

(Civilization, Page. 446)

مندرجہ بالا تحریروں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ ہو گا کہ عیسائیت ان مفکرین کے نزدیک علم و بصیرت کی دشمن، م و فکر کی حریف، عدل و انصاف سے غافل اور سائنسی ریسرچ کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔

اس کے مقابل مشہور مورخ Denison اپنی شہرہ آفاق کتاب Emotion as Basis of Civilization میں سلام کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتا ہے۔

"اس وقت ایسا دکھائی دیتا تھا کہ تہذیب کا وہ قصرِ مُشَیَّد جس کی تعمیر میں چار ہزار سال صرف ہوئے تھے، منہدم ہونے کے قریب پہنچ چکا تھا اور نوعِ انسانی پھر اسی بربریت کی طرف لوٹ جانے والی تھی جہاں ہر قبیلہ دوسرے قبیلے کے خون کا پیاسا تھا اور آئین و ضوابط کو کوئی جانتا تک نہ تھا... غرضیکہ وقت وہ آچکا تھا جبکہ ہر طرف فساد ہی فساد نظر آتا تھا۔ تہذیب کا وہ بلند و بالا درخت جس کی سرسبز و شاداب شاخیں کبھی ساری دنیا پر سایہ فگن تھیں اور آرٹس، سائنس اور لٹریچر کے سنہری پھلوں سے لدی ہوئی تھیں، اب لڑکھڑا رہا تھا۔ عقیدت و احترام کی زندگی بخش نمی اس کے تنے سے خشک ہو چلی تھیں اور وہ اندر سے کھوکھلا ہو چکا تھا... جنگ و جدل کے طوفان نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تھے جو صرف پرانی رسموں کے بندھن سے جکڑے تھے اور ان کے متعلق خطرہ تھا کہ اب گرے یا اب۔"

"کیا ان حالات میں کوئی ایسا جذباتی کلچر پیدا کیا جا سکتا تھا جو نوعِ انسان کو ایک مرتبہ پھر ایک نقطہ پر جمع کر دے؟"

از خود ہی وہ اس سوال کا جواب دیتا ہے کہ

"یہ امر موجبِ حیرت و استعجاب ہے کہ اس قسم کا نیا کلچر عرب کی سرزمین سے پیدا ہوا جبکہ اس کی اشد ضرورت تھی"

کوئی وقت تھا کہ انسانیت نے علم و بصیرت کی روشنی میں آگے بڑھنا چاہا تو دنیا نے اس مذہب کی رہنمائی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

قرآن مجید نے کائنات کی تخلیقی ترکیب پر غور و فکر کی ترغیب دی۔ مسلمانوں نے اس کی رہنمائی میں قدم بڑھا کر فطرت کا علم حاصل کر کے کائناتی قوتوں کو مسخر کیا تو نوعِ انسان کے لئے برکات کا دور بن گیا۔ سپین (ا مسلمانوں کے زیر اثر آیا تو اس وقت اندلس یورپ کا غریب ترین ملک تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس ملک نے ترقی حاصل کر لی کہ اس ملک کی دولت و ثروت یورپ کی مجموعی دولت سے بھی زیادہ ہو گئی۔ اسے دیکھ کر یورپ والوں نے علوم سائنس کی طرف توجہ دی ورنہ اس زمانے میں یورپ میں علم حاصل کرنا ایک معیوب بات تھی۔ وہاں نہ کالج تھا نہ سکول۔ تمام تعلیمی ادارے مسلمانوں نے قائم کئے۔

ایک مشہور اور معروف شخصیت رابرٹ برفالٹ جس نے اس حقیقت کا اعتراف اپنی کتاب "تشکیلِ انسانیت" Making of Humanity میں ان الفاظ میں کیا ہے۔

"راجر بیکن نے عربی اور علوم عربیہ کی تعلیم پائی۔ تجربی منہاج کی اشاعت پر فخر کرنے کا حق راجر بیکن کو پہنچتا ہے..... راجر بیکن کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ مسیحی یورپ میں اس کا شمار اسلامی سائنس اور منہاجِ سائنس کے مبلغین میں ہوتا ہے وہ یہ کہتے کبھی نہیں تھکا کہ اگر اس کے معاصرین کو سچ مچ علم کی تلاش ہے تو انہیں چاہئے کہ عربی علوم کی تحصیل کریں۔ رہی یہ بحث کہ منہاجِ تجربی کس کی ایجاد ہے.... سو یہ بھی ایک نمونہ ہے ان زبردست غلط بیانیوں کا جو مغربی تہذیب کے مبداء و مآخذ کے بارے میں کی جاتی ہیں (کہ اس نے کسی غیر مغربی تہذیب و تمدن سے کوئی اثر قبول نہیں کیا)۔ اس لئے کہ بیکن کا زمانہ آیا تو عربوں کا تجربی منہاج سارے یورپ میں پھیل چکا تھا اور لوگ بڑے اشتیاق سے اس کی طرف بڑھ رہے تھے" (ص 202)

"سب سے بڑا احسان جو عربی تہذیب و ثقافت نے جدید دنیا پر کیا ہے وہ سائنس ہے' گو اس کے ثمرات بہت آگے چل کر ظاہر ہوئے۔ یہ عفریت اپنی شان و قوت سے نمودار ہوا تو اس وقت' جب اسلامی اندلس تاریکی کے پردوں میں چھپ چکا تھا۔ لیکن یہ صرف سائنس ہی نہیں جس سے یورپ کے اندر زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ اسلامی تہذیب و تمدن کے اور بھی متعدد اور گوناگوں اثرات ہیں جن سے یورپ میں پہلے پہل زندگی نے آب و تاب حاصل کی۔" (ص

پتہ نہ چلے لیکن اس کا سب سے بڑا اور روشن ثبوت اس طاقت کے ظہور سے ملتا ہے جو عصرِ حاضر کی مستقل اور نمایاں ترین قوت اور اس کے غلبے اور کارفرمائی کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے۔ ہمارا مطلب علومِ طبعیہ اور روحِ علم کے ظہور سے ہے" (ص 190)

"پھر اگر ہم علومِ طبعیہ میں عربوں کے مرہونِ منت ہیں تو اس لئے نہیں کہ انہوں نے بڑے بڑے انقلاب آفریں نظریوں کی بنیاد رکھی' بلکہ اس سے بھی بڑھ کر کسی اور چیز' یعنی سائنس کی ہستی اور وجود کے لئے۔ دنیائے قدیم کو' جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں' عہدِ قبلِ سائنس کی دنیا تصور کرنا چاہئے۔ پندرھویں صدی تک یورپ ان علوم و فنون کو اپناتا رہا جو اسے مسلمانوں نے دیئے تھے' اس میں کوئی اضافہ پیش نہ کر سکا.... ہم جسے سائنس کہتے ہیں' یورپ میں اس کا ظہور تحقیق و تفتیش کی جس نئی روح کی بدولت ہوا وہ نتیجہ تھی اس کے نئے نئے منہاجاتِ تحقیق' منہاجِ تجربی' مشاہدے' پیمائش اور ریاضی کی ایک ایسی شکل جس سے اہلِ یونان سرتاسر بے خبر تھے۔ یہ نئی روح اور نئے منہاجات یورپ میں پھیلے تو عربوں کے ذریعے" (ص 109)

اسلام محض چند عقائد' مذہبی رسوم اور اخلاقی ضابطہ کا مجموعہ نہیں۔ بلکہ یہ ایک مکمل ہمہ گیر نظامِ زندگی ہے جو حیاتِ انسانی کے ہر گوشے کو محیط ہے۔ اسلام پر انفرادی طور پر نہیں بلکہ صرف اور صرف اجتماعی طور پر ہی عمل پیرا ہوا جا سکتا ہے۔ اس کا نصب العین ایسے نظامِ حکومت کا قیام ہے جو قرآنی قوانین (یعنی قوانینِ خداوندی) پر قائم ہو۔ اس نظامِ زندگی میں حکومت کی یہ بھی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے کہ :

کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محتاج ہو اور نہ محکوم۔

ہر ذی حیات کو رزق پہنچتا رہے اور ہر انسان کو سامانِ نشوونما میسر ہو (رزق میں وہ تمام چیزیں آجاتی ہیں جس پر زندگی کی بقا اور استحکام کا دارومدار ہو)۔

معاوضہ محنت کا ہو سرمایہ کا نہیں۔

زمین کسی کی ملکیت میں نہ رہے۔ زمین صرف حکومت کی تحویل میں رہے اور اس کا نظم و نسق ایسے ہو جس سے عام افرادِ معاشرہ کو رزق حاصل ہوتا رہے۔

ہر شخص اپنی پوری استعداد و محنت سے کام کرے (بجز ان کے جو کسی وجہ سے کام کرنے سے معذور ہو گئے ہوں) ایسا نہ ہو کہ کچھ لوگ محنت کریں اور باقی ان کی کمائی پر مفت عیش اڑائیں۔

ہر شخص اپنی محنت کے ماحصل میں سے اپنے لئے صرف اتنا رکھے جس سے اس کی ضروریات پوری ہوں۔ جو کچھ افراد کی ضروریات سے زائد ہو وہ سب کا سب اپنے دل کی رضا مندی سے حاجت مندوں کی ضروریات کے لئے وقف کر دے۔

ایسا خوشگوار ماحول پیدا کیا جائے جس میں انسانیت نشوونما کرتی ہوئی ارتقائی منازل طے کر کے کمال تک پہنچ سکے۔

اس قسم کے نظام کا قیام ممکن اس لئے ہوتا ہے کیونکہ نظام قائم کرنے والوں کا ایمان ہوتا ہے کہ :

انسانی زندگی طبیعی موت سے ختم نہیں ہوتی۔ زندگی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی مسلسل آگے چلتی

ہے۔ اگلی کڑی سابقہ کڑیوں سے مختلف ہے۔ اُخروی زندگی میں انسانوں سے متعلق فیصلے اعمال کے مطابق ہونگے۔

اپنا مال دوسروں کی ضروریات کے لئے دینے سے انسان کی اپنی نشوونما ہو جاتی ہے۔ انسان کی اُخروی زندگی ہر اس چیز سے پرورش پاتی ہے جسے وہ دوسروں کی پرورش کے لئے دیتا ہے۔ جتنا زیادہ دوسروں کو دے گا اتنی ہی زیادہ اس کی ذات کی نشوونما ہو گی۔

عیسائیت اور اسلام کی تعلیمات کا تقابلی جائزہ آپ نے مستشرقینِ مغرب کی زبان سے سنا۔ بنظرِ غائر دیکھا جائے تو یہی وہ تضاد ہے جو عیسائی دنیا کو وقفِ اضطراب رکھے ہوئے ہے اور وہ نبی اکرم محمد رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی کو دوسرے انبیاء سے کم تر دکھانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں ہونے دیتے۔ یہاں تک کہ اپنی درسگاہوں میں حضور نبی اکرم ﷺ کا نام لینا بھی گوارا نہیں کرتے۔ چنانچہ اخبار العالم الاسلامی مورخہ 7 جولائی 1986ء (یہ اخبار مکہ مکرمہ کے مشہور بین الاقوامی ادارے' رابطہ العالم الاسلامی کا ترجمان ہے) میں ایک خبر شائع ہوئی جس کا عنوان تھا "رسالتِ محمدیؐ پر نیا حملہ"۔ خبر کے مطابق امریکی کانگریس کی مشہور لائبریری نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس کی جتنی دستاویز ہیں اس میں حضرت محمدؐ کی رسالت کا مطلقاً کوئی ذکر نہ ہو' بلکہ آپ کو ایک عام انسان کے طور پر پیش کیا جائے کیونکہ اس لائبریری کی دستاویزات کو ساری دنیا میں سند حاصل ہے اور ہر جگہ بطور حوالہ استعمال کی جاتی ہیں۔ اسلام کے لئے یہ فیصلہ نہایت ہی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ اس سے علمی دنیا میں' رفتہ رفتہ یہ تاثر قائم ہو جائے گا کہ حضرت محمد صلعم' اللہ کے رسول نہیں تھے بلکہ دوسرے مصلحین کی طرح ایک عام مصلح تھے۔ اس طرح دین اسلام کے بارے میں یہ دعویٰ کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا کیا جانے والا مکمل ضابطۂ حیات ہے مشکوک ہو جائے گا۔ اس فیصلے کے خلاف امریکہ میں موجود تمام مسلمانوں نے احتجاج کیا اور تمام مسلمانوں سے تعاون کی اپیل کی تھی۔ سطورِ بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ یورپ اور امریکہ کے ذرائع ابلاغ مختلف طریقوں سے اسلامی تعلیمات پر کیچڑ اچھالتے رہتے ہیں۔ پاکستان میں' غالباً 1983ء کی بات ہے' ایک دینی ادارے سہیل اکیڈمی لاہور نے ایک مستشرق مارٹن لنگز کی کتاب "محمد" شائع کی۔ اس کتاب میں رسول اللہ صلعم کی تعریف کی گئی تھی لیکن آپ کو اللہ کے رسول کے طور پر پیش نہیں کیا گیا بلکہ ایک عام انسان کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ دوم آپ کی نجی زندگی کے بارے میں ایسی باتیں کہی گئیں جس کی ایک شریف آدمی سے توقع بھی نہیں کی جا سکتی۔ اس کتاب کے مطالعہ سے یہ صاف ظاہر ہے کہ رسالتِ محمدی پر حملہ کا منصوبہ تیار ہو چکا ہے۔

مسیحیت (عیسائیت) کو نبوت' رسالت اور وحی سے انکار ہے۔ مشکل یہ ہے کہ تاریخ کے مطابق مسیحیت کی ابتدا ایک یہودی فرقے کی حیثیت سے ہوئی۔ اس لئے مسیحیت کو ان اصطلاحات کی تعبیر خاص رنگ میں کرنی پڑی۔ یہودیت میں نبی' ہیکل کے ایک خاص منصبدار کا لقب تھا جو پیش گوئیاں کرتا تھا۔ لہٰذا عام طور پر جس شخص کو غیب دانی کا دعویٰ ہو اور مستقبل کی پیش گوئیاں شروع کر دے اسی کو نبی کہا جاتا ہے۔ اس لئے انگریزی میں نبی کو Prophet کہتے ہیں یعنی پیش گوئیاں کرنے والا۔ جہاں تک رسول کا تعلق ہے اناجیل کے اردو تراجم میں رسول کو Apostel کہا گیا ہے۔ شروع میں اس کا اشارہ مسیحؑ کے حواریوں کی طرف تھا لیکن بعد میں آہستہ آہستہ ان میں اولیا و صلحائے مسیحیت کے ناموں میں اضافہ ہوتا رہا اور اس وقت رسول کا مفہوم لیا جاتا ہے ایک بلند مرتبہ انسان جو صحیح مذہبی

زندگی کا نمونہ ہو اور وہ اپنے آپ کو مذہب کی خدمات کے لئے وقف کر دے۔

قرآن کریم کے مطابق نبی کے معنی ہیں' بلند مقام پر کھڑا ہونے والا۔ علم کے سرچشمے دو ہیں ایک عقل (Human Intellect) اور دوسرا وحی۔ وحی وہ علم ہے جو خدا کی طرف سے براہ راست انبیاء کرامؑ کی وساطت سے حاصل ہوتا اور ان کے ذریعے انسانوں کو ملتا ہے۔ وہ خدا کے قوانین جو خدا کی طرف سے انسانی' معاشرتی اور تمدنی زندگی بسر کرنے کے لئے وضع کردہ ہیں "الوہی" کہلاتے ہیں۔ انسان بھی کائنات کی چیز ہے لہٰذا اسے بھی منازل طے کر کے کچھ بننا ہے ان منازل طے کرنے کے لئے خدا کی طرف سے قوانین مقرر ہیں۔ انسان ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے سے ہی اگلی منزل تک پہنچ سکتا ہے۔ جس مقام پر نبی کھڑا ہوتا ہے وہ ایک طرف وحی کے ذریعے (دنیائے محسوس و غیر محسوس) حقائق کا مشاہدہ کر لیتا ہے اور دوسری طرف اس علم (وحی) کو لے کر انسانوں کی دنیا کی طرف آتا ہے تاکہ ان حقائق کو ان تک پہنچائے اور وحی کو ایک عملی نظام کی زندگی بنانے کے لئے عملاً متشکل کر کے دکھائے۔ یہ منصب رسالت ہے (یعنی وحی کو دوسروں تک پہنچانا۔ نبی اور رسول ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہوتے ہیں ان میں کچھ فرق نہیں ہوتا۔)

نبی کا انتخاب اللہ خود کرتا ہے (6:135)۔ جو علیم بھی ہے اور حکیم بھی (4:26)۔ وہ تمام رازوں سے واقف ہے (25:6)۔ جو لوگ چلے گئے ان کے حال سے بھی واقف اور جو آنے والے ہیں ان سے بھی آگاہ (15:24)۔ قرآن مجید نے رسول اکرمؐ کا تعارف کچھ اس طرح کرا دیا ہے کہ آپ معزز' بلند اخلاق کے حامل اور قابل اعتماد تھے۔ (68:4)۔ آپ قرآن کا علم ملنے کے بعد علم کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ گئے تھے (53:6-10)۔ نبی اکرمؐ کی وساطت سے جتنی وحی کی ضرورت تھی وہ دیدی گئی اور اسے قرآن کریم کے اندر محفوظ کر دیا گیا۔ محمدؐ کے ساتھ نبوت کا سلسلہ ختم کر دیا گیا (33:40)۔ اب کوئی انسان خدا کی طرف سے وحی نہیں پا سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ غیر مسلم اقوام جانتی ہی نہیں کہ ایک نبی کا صحیح مقام کیا ہوتا ہے۔ اس لئے وہ اندازہ ہی نہیں لگا سکتے کہ ہم مسلمانوں کے نزدیک حضور اکرمؐ ختمی مرتبت (فداہ امی وابی) کا بلند و بالا مقام کیا ہے اور ہمارے قلوب میں اس ذات گرامیؐ کی رفعت و عظمت کس شدت کی ہے۔ یہی تو مومن ہونے کی اولین شرط ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ :

"مومنین کو نبی سے اپنی جان سے بھی زیادہ لگاؤ ہے اور ان کی بیویاں ان کی مائیں ہیں" (33:6)۔

دنیا کو شاید معلوم نہیں کہ ایک مسلمان کے دل میں حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر مر مٹنے کی تمنا کتنی شدید ہوتی ہے۔ تحفظ ناموس رسولؐ جماعت کی قوت سے ہی ہو سکتا ہے۔ کسی کی کیا مجال ہو سکتی ہے کہ حضور اکرمؐ تو کجا ان کے ادنیٰ غلام کی طرف بھی آنکھ اٹھا کر دیکھ سکے۔ ان حالات میں مسلمان یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ مسیحیوں اور دیگر غیر مسلموں کو کھلی اجازت دی جائے کہ جیسے چاہیں رسول اکرمؐ کی شان میں گستاخی کرتے پھریں۔ کسی بھی ملک کا قانون اجازت نہیں دے سکتا کہ کسی کے خلاف ناحق تہمت لگائی جائے۔ ایسا کرنا دنیا کے ہر قانون میں جرم ہے۔ قرآن کریم کے مطابق بھی ناحق تہمت اور بہتان جرم ہے۔

قرآن کریم نے جو احکام دیئے ہیں وہ دو قسم کے ہیں۔ ایک اخلاقی' جن کی خلاف ورزی معاشرہ کے خلاف جرم نہیں۔ اس لئے ان کی تعزیری سزا بھی نہیں ہے دوسری قسم میں وہ احکام آجاتے ہیں جو معاشرتی جرم ہیں۔ جنہیں

حکام کہا جاتا ہے۔ تعزیری احکام جن کی خلاف ورزی کی سزا دی جا سکتی ہے دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جن کی سزا بھی قرآن کریم نے دیا ہے اور دوسرے وہ جن کی سزا کا ذکر نہیں۔ ان جزئیات کا تعین اور ان کی خلاف ورزی کی سزا اسلامی معاشرہ (قرآنی حکومت) اپنے حالات کے مطابق خود مقرر کرے گی۔ وہ جرائم جن کی سزا قرآن نے دی ہے ان میں سے ایک جرم تہمت بھی ہے۔ کسی کے خلاف غلط افواہیں پھیلانا' جس سے اس کی شہرت داغدار ہو سنگین جرم ہے۔ اور اس کی سزا شہریت کے حقوق سے محرومی سے لے کر قتل تک ہے (33:60-61)'(6:12) (تبویب القرآن از علامہ پرویزؒ ص 440)۔ لہٰذا ایک مسلم حکومت حضور اکرمؐ ختمی مرتبت یا کسی بھی نبی کی شان میں گستاخی کیسے برداشت کر سکتی ہے؟ مسلمانوں کی غیرتِ ایمانی اس گستاخی کو گوارا کرنے کے لئے کبھی تیار نہیں ہو سکتی۔

جہاں تک مسیحیوں کا یہ خدشہ ہے کہ یہ قانون مسیحیوں کے خلاف ذاتی دشمنی کی بنا پر استعمال ہو گا تو نہیں معلوم ہونا چاہئے کہ قرآن نظامِ عدل کو بنیادی اہمیت دیتا ہے اور عدل کے متعلق شدت سے تلقین کرتا ہے۔ محض پند و نصیحت سے عدل قائم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے ایسی تدابیر اختیار کی جائیں کہ قرآنی اصولوں کے مطابق نظامِ عدل عملاً قائم ہو۔ عدل درحقیقت نام ہی قانون کے یکساں طور اطلاق کا ہے۔ قرآن کریم نے یہاں تک کہہ دیا کہ کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم ان سے عدل نہ کرو۔ ہمیشہ عدل کرو کہ یہی چیز تقویٰ کا تقاضا ہے۔ عدل کا بنیادی ستون شہادت (Evidence) ہے۔ حکمِ خداوندی ہے کہ شہادت نہ مدعی کی طرف سے ہو نہ مدعا علیہ کی طرف سے۔ تم خدا کی طرف سے گواہ بن کر کھڑے ہو اور ہمیشہ عدل و انصاف کو مدنظر رکھ کر سچی سچی شہادت دو.... (4:135) جرم ثابت ہونے سے پہلے ملزم کو بے گناہ سمجھا جائے۔ تحقیق سے پہلے اس کے متعلق حسنِ ظن سے کام لیا جائے (24:12,16)۔ عدل سے مقصود صرف مجرموں کو سزا دینا ہی نہیں بلکہ مظلوم کے نقصان کو پورا کرنا بھی ہے (17:33)۔ مملکت کا فریضہ ہے کہ ان اصولوں کی روح اپنے نظام میں جاری و ساری کرے۔ اس مقصد کے لئے قانون میں مناسب ترمیم کرے تاکہ کسی کے ساتھ ظلم نہ ہو سکے۔ حکومت کا فریضہ ہے کہ قرآنی عدل کے حصول کو یقینی بنایا جائے اور اس میں کسی قسم کا امتیازی سلوک روا نہ رکھا جائے۔ جس معاشرہ میں عدل باقی نہ رہے اس کی کوئی شے بھی اپنے صحیح مقام پر نہیں رہتی۔ اس مقصد کے لئے یہ امر بھی اتنا ہی ضروری ہے کہ توہینِ رسالت کے قانون کی کوئی شق اگر واضح نہ ہو تو اس کی وضاحت اس طرح سے کر دی جائے کہ کسی کے ذہن میں اس کے متعلق کوئی ابہام نہ رہے لیکن قانون اور قانون کا بھرپور اطلاق ہر اس آدمی کے ایمان کا تقاضا ہے جو نبی اکرم محمد رسول اللہ ﷺ اور ان سے پہلے آنے والے انبیاء کرامؑ پر ایمان رکھتا ہے۔

آپ طلوع اسلام کی مدد کیسے کر سکتے ہیں؟

☆۔ اپنے احباب کو طلوع اسلام کا خریدار بنایئے۔ ☆۔ اپنے شہر میں طلوع اسلام کی ایجنسی قائم کیجئے۔

☆۔ کسی مقامی ایجنٹ کو تیار کیجئے کہ وہ طلوع اسلام کا لٹریچر منگائے۔

☆۔ ممکن ہو تو اپنے علاقے سے طلوع اسلام کے لئے اشتہار مہیا کیجئے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علامہ رحمت اللہ طارق

قرآن کے مخاطب ان پڑھ تھے یا پڑھے لکھے؟

مکرمی ارشاد احمد حقانی صاحب نے اپنے کالم، روزنامہ جنگ مورخہ یکم نومبر 98ء میں میاں طفیل محمد کے حوالہ سے لکھا ہے کہ---- اسلام تو ہے ہی ان پڑھوں کا مذہب۔ ہمارا تو رسول بھی ان پڑھ تھا...... ابوبکرؓ، عمرؓ کہاں سے پڑھے ہوئے تھے۔ عثمانؓ، علیؓ کہاں کے پڑھے ہوئے تھے (جنگ ص 8، کالم 7)

توقع تھی کہ ایک دو بالغ نظر و اصابت رائے کے مالک اصحاب اس کا نوٹس لیں گے لیکن کسی نے ادھر توجہ نہیں فرمائی۔ تشنگی رہ گئی۔

عام طور پر ہمارے ہاں "امیت" (ان پڑھ ہونے) کو فضائل نبوت میں شمار کیا جاتا ہے (یہاں اس سے بحث نہیں) لیکن اس سے یہ اخذ کرنا کہ تمام عرب تھے ہی ان پڑھ۔ اس کی صحت مشتبہ اور صداقت غیر یقینی ہے۔ مکہ، سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے لے کر بعثت نبوی ﷺ تک تمام اقوام کا مرکز نگاہ بنا ہوا تھا۔ دور دراز کے لوگ عبادت کرنے بھی آتے تھے، سیاحت اور تجارت کرنے بھی۔ ہمسایہ ملکوں سے تحریری معاہدے بھی ہوتے تھے اور وثائق کا تبادلہ بھی۔ حرب فجار نے عربوں کو تباہ کر رکھا تھا۔ نبی اکرم ﷺ کے چچا زبیر (593 م) بن عبدالمطلب نے اس مضمون کا عہد نامہ تحریر کیا کہ تمام قبائل دستخطی عہد کریں کہ آئندہ کوئی قبیلہ کسی دوسرے قبیلہ پر حملہ نہیں کرے گا اور جس نے پہل کی تمام قبائل مل کر اس کی سرکوبی کریں گے۔

تاریخ نے اس عہد نامہ کو "حلف الفضول" کے نام سے متعارف کرایا اور اس نے عربوں میں زبردست اہمیت حاصل کر لی کیونکہ یہ زبیر کی قیادت میں منعقد ہوا تھا۔ وہ ذی وجاہت اور باتدبیر حکمران تھے۔ فصیح اللسان، ادیب اور شاعر تھے۔ ان ہی نے اپنے چہیتے بھتیجے حضور نبی اکرم ﷺ کو حکمرانی کی تربیت دینے کی غرض سے دیگر معاملات کی طرح حلف الفضول کی تقریب میں بھی شامل کر دیا تھا۔ اس وقت آپ ﷺ کی عمر مبارک 21، 22 سال تھی (ابن سعد طبع لندن جلد 1/24- ابن ابی الحدید طبع مصر جلد 3/445)- جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مکہ والوں کو بالجملہ ان پڑھ نہیں کہا جا سکتا۔ امام ابن الفارس ابو الحسین احمد بن فارس بن زکریا (1004 م) نے اہل مکہ کے بوقت نزول قرآن، ناخواندہ ہونے کی شدید مخالفت کرتے ہوئے اپنی نادرۂ روزگار کتاب "الصاحبی" میں سینکڑوں صحابہ اور مشرکین کے نام گنوائے ہیں جو پڑھے لکھے اور مختلف علوم میں اچھی دسترس رکھتے تھے پھر بعد از تفصیل لکھا ہے **وما العرب فی قدیم الزمان الاکنحن الیوم فما کل یعرف الکتاب والخط والقراۃ۔**

یعنی قدیم زمانے کے عرب بھی ہماری ہی طرح کے تھے اور جس طرح ہم میں سے ہر شخص پڑھا لکھا نہیں ہوتا اسی طرح ان میں بھی سب کے سب نہ تو ان پڑھ

ور نہ ہی پڑھے لکھے (الصاحبی طبع مصر جلد 11/8 19:0 م)

ابن الفارس کی یہ نہایت ہی معتدل رائے ہے۔ س کر تاریخ نے کاتبان وحی کو نہ صرف پڑھا لکھا بتلایا ہے بلکہ اصناف سخن کا ماہر بھی لکھا ہے۔ مثلاً ابوبکرؓ و عثمانؓ، علیؓ، عائشہؓ، عبداللہ بن مسعودؓ و معاویہ بن ابی سفیانؓ اور زید بن ثابتؓ وغیرھم۔ ایسے میں نام لے کر خلفائے راشدین کو ان پڑھ کہنا بلکہ سمجھنا کہ اسلام تو ہے ہی ان پڑھوں کا مذہب۔ ہمارا تو رسول بھی ان پڑھ تھا۔۔۔ سطحی انداز فکر ہے۔ قرآن جس نے اپنے نزول کے وقت، جو لوگ فصاحت و بلاغت کے دریا بہاتے تھے، اپنے اعجازی اسلوب سے سب کو شہ مات دی اور رہنمائی کے ایسے عالمی اصول دنیا کے سامنے پیش کئے جو آج بھی اپنا مثیل نہیں رکھتے۔ بلکہ آج اس ترقی یافتہ دور میں لسانی شناوروں نے ہماری اس عالی رتبہ کتاب کو دنیا کی ادبیات عالیہ میں اونچا مقام دے کر اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ ایسی عظیم امانت کسی ان پڑھ قوم کو ودیعت نہیں کی جا سکتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی علمی اور فکری توانائیوں کو ختم کرنے کیلئے ان لوگوں نے مستشرقین و دیگر اہل انحراف کو اس نوعیت کا خام مال خود ہی مہیا کیا ہے اور اب وہ پوری جسارت سے کہہ رہے ہیں کہ قرآن نے جاہل طبقے کو للکارا اور جاہلوں ہی کو دعوت مبارزت دی۔ اگر کسی مہذب قوم یا تعلیم یافتہ سوسائٹی کو مخاطب کرتا تو جلد ہی اس کی اعجازی حیثیتوں کا پول کھل جاتا؟

میاں صاحب کی طرح سطحیت پسند یہ بھی کہتے ہیں کہ قرآن میں مکہ والوں اور خود نبی اکرم ﷺ پر "امیت" کا اطلاق کیا گیا ہے۔ جی ہاں لیکن ان سب نے آیات کے پس مناظر کو اساس بنا کر ہی یہ رائے قائم کی اور یہ غور نہیں فرمایا کہ یہاں امیت سے مراد کتابی امیت ہے، علمی امیت نہیں ہے۔ یعنی قرآن سے پہلے ان کے پاس ایسی دینی کتاب نہیں تھی جس طرح کہ اہل کتاب کے پاس تورات و انجیل تھیں۔

ازہر یونیورسٹی کے سابق ریکٹر علامہ حسنین محمد مخلوف (Makhloof) "کلمات القرآن" میں "امیین" کی ذیل میں لکھتے ہیں "مشرکی العرب" یعنی عرب کے مشرک (ص 43) دوسری جگہ تحریر کرتے ہیں العرب المعاصرون لہ، نبی اکرم ﷺ کے ہم عصر عرب (ص 434) اور ظاہر ہے کہ ان دنوں وہ کسی دینی کتاب کے حامل نہیں تھے۔ شرک ہی ان کا دین تھا۔ اور یہ نہ صرف ہماری یا حسنین مخلوف کی رائے ہے، قرآن حمید کی ذیل کی آیت بھی یہی رہنمائی کرتی ہے۔۔ وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ○ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ (2:78-79)- حاصل ترجمہ یہ کہ "ان میں ایک فریق ایسا بھی تھا جو امی تھا یعنی علم کتابی سے ناآشنا تھا۔ ہاں جھوٹ موٹ کا تو انہیں علم تھا (لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ صرف) ان کا اپنا ظن (فاسد) تھا۔ پس جو لوگ جلب منفعت کیلئے اپنے ہاتھوں کی تحریر کو کتاب اللہ کہہ کر لوگوں کو حقیر داموں بیچتے ہیں ان کے حال پر نہایت افسوس ہے"۔ (بقرہ، 78،79)

اب یہاں اگر کتابی "امیت" مطلوب نہ ہوتی تو اللہ سبحانہ "یکتبون الکتاب" کہہ کر ان کے لکھنے کی خبر کیوں دیتے؟ بلکہ مکرر فویل لھم مما کتبت ایدیھم فرما کر ان کے لکھنے پڑھنے کی توثیق فرما کر سہ آتشہ یقینی کیوں بناتے؟۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ دینی جاہل تھے علمی جاہل نہیں تھے۔ وہ نفس تعلیم سے آشنا تھے مگر صاحب کتاب نہیں تھے یعنی کتابی اُمّی تھے۔ اس کا نہ صرف تمام عرب کو احساس تھا خود صحابہ کرامؓ بھی (بقرہ،

79,78) کی سمجھتے رہے۔ مفسر ابن جریر طبری (923 م) اپنی سند سے حضرت عبداللہ بن عباس (688 م) سے روایت کرتے ہیں **اَلْاُمِّیُّوْنَ قوم لم یصد قو رسولاً ارسلہ اللّٰہ ولا کتابا انزلہ اللّٰہ فکتبوا کتابا بایدیھم ثم قالوا لقوم سفلۃ جہال ھذا من عنداللّٰہ وقال قد اخبر انھم یکتبون بایدیھم ثم سماھم امیین لجحود ھم کتاب اللّٰہ و رسولہ**

"یعنی امیوں سے وہ قوم مراد ہے جس نے نہ تو کسی رسول کی تصدیق کی اور نہ ہی کسی نازل شدہ کتاب پر ایمان لے آئی۔ (اس کے باوجود) اپنے ہاتھوں کی تحریر کو نچلے اور سطحی ذہن جاہلوں پر پیش کر کے کہتے کہ یہ اللہ ہی کی کتاب ہے۔ اس طرح یہاں اللہ سبحانہ' نے خبر دی ہے کہ وہ اپنے ہاتھوں سے لکھتے تھے (یکتبون) اس کے باوجود انہیں "امی" کہا تو ظاہر ہے وہ حقیقی ان پڑھ نہیں تھے۔ کتاب اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے انکاری تھے"۔

(تفسیر طبری شائع کردہ محمود احمد شاکر طبع دارالمعارف جلد 2/258, 259-- نیز **المراۃ فی الشعر الجاھلی** ڈاکٹر احمد محمد خوفی' ص 333,334)

یہاں میاں طفیل محمد کے مبلغ علم کی بات نہیں۔ ہماری روایات اور مدحیہ شاعری نے بھی ان پڑھ ہونے کو نبوت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم کا خاصہ قرار دے کر چنگے بھلے راسخین فی العلم کو بھی ڈگمگا دیا ہے حالانکہ قرآن محکم کی گواہی ہے کہ **نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ** (68:1)- یعنی قلم اور قلم سے تحریر کردہ سطروں کو گواہ بنا کر علم و تحریر کی نہ صرف خبر دی گئی ہے' حوصلہ افزائی بھی کی گئی ہے۔ مزید ارشاد ہے **اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنْ کِتَابِ رَبِّکَ** اے رسول ﷺ جو کچھ تمہاری طرف وحی کی گئی ہے اسے لوگوں کو پڑھ کر سنا دو (کہف' 27)- نیز فرمایا- **یَتْلُوْا صُحُفًا**-- یہ رسول ﷺ تمام صحیفوں کو پڑھ کر سناتے ہیں (البینۃ 2 تا 3)- ان آیات میں تلاوت کا لفظ بطور خاص قابل غور ہے کہ اس کے معنے یوں تو ساتھ ساتھ چلنے' پیچھے آنے احکام کی اطاعت کرنے اور فرامین الٰہی پر چلنے کے ہیں لیکن جب پڑھنے کے معنے ہوں تو صرف قرآن کا پڑھنا مراد ہے۔ قراۃ اور تلاوت میں فرق یہ ہے کہ قرات عام ہے۔ قرآن کے علاوہ ہر تحریر کے پڑھنے پر اس کا اطلاق ہوا ہے اور تلاوت صرف قرآن پاک کی تلاوت سے خاص ہے۔ ایسی تلاوت جس کے لفظوں کا نظر پیچھا کرتی چلی جائے یعنی دیکھ کر پڑھنے کو تلاوت کہا جاتا ہے جبکہ قرات دیکھ کر اور حافظ کی دوہری قرات کو کہتے ہیں۔ اس طرح یہ بات واضح ہو گئی کہ رسول اللہ ﷺ دیکھ کر پڑھتے تھے جس کی شہادت ذیل کی آیات سے ملتی ہے۔ (یونس' 19-- بقرہ' 125-151-- عمران' 164-- قصص' 59-- طلاق' 11-- یونس' 61-- قصص' 45-- عنکبوت' 48-- رعد' 32-- نمل' 92-- انعام' 15-- عنکبوت' 45-- مائدہ' 30-- اعراف' 174-- یونس' 71-- شعراء' 70-- عمران' 93-- کہف' 27 وغیرہ۔ ان آیات میں "تلاوت" دیکھ کر پڑھنے کی غماز ہے۔

قرآن کی ان داخلی شہادتوں کے بعد یہ کہنا کہ رسول اللہ ﷺ' خلفائے راشدین اور تمام اہل عرب خاص طور پر مکے والے جاہل اور ان پڑھ تھے عقل کی بربادی تو کہہ سکتے ہیں' دانش افروزی نہیں کہہ سکتے۔ قرآن لین دین کے معاملہ میں تحریر کو لازمی قرار دیتا ہے وہ جاہلوں اور ان پڑھوں سے لکھنے اور گواہی ثبت کرنے کا مطالبہ کیسے کر سکتا ہے؟-- ہمارے نزدیک مکہ کا ایک نام ام القریٰ بھی ہے۔ ام کے معنی ماں اور بنیاد کے ہیں۔ یعنی دنیا کے مقدس مقامات کی ماں مکہ ہے اور اسی مناسبت سے اہل مکہ کو تلخیص کے طور پر "امیین" بھی کہتے تھے یعنی مکہ والے-- اور تلخیص کا رواج ہر زبان میں ملتا ہے۔ مثلاً" ہمارے ہاں ٹوبہ ٹیک سنگھ کو صرف ٹوبہ بھی کہا جاتا ہے لیکن افسوس کہ اذہان نے مکہ' جو کہ ایک شہر تھا اسے ان پڑھ انسان بنا دیا۔ کاش لوگ مذہبی شاعری اور روایات کو پرکھنے کی عادت ڈالتے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد چدھڑ (گوجرانوالہ)

اسلامی نظام کا محور

ہماری حکومت نے نفاذِ شریعت کیلئے بل پیش کیا اور اسمبلی سے اسے منظور بھی کرا لیا۔ اب یہ بل سینٹ میں پیش ہو گا اور اگر وہاں اسے دو تہائی کی اکثریت حاصل ہو گئی تو پھر جناب صدر کے دستخطوں سے یہ قانون کی شکل اختیار کر لے گا۔ بہرحال یہ ابھی دور کی بات ہے۔ سینٹ میں کیا منظور ہوتا ہے اور کیا نہیں ہوتا یہ تو وقت ہی بتلائے گا۔ البتہ آثار سے یوں لگتا ہے کہ یہاں اندرونِ خانہ دینِ خداوندی کے بجائے تھیوکریسی کے نفاذ کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اپنے ابتدائی اعلان میں وزیراعظم صاحب نے قومی اسمبلی میں خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ان کی حکومت نے آئین میں پندرھویں ترمیم کا فیصلہ کر لیا ہے۔ جس کے تحت قرآن و سنت ملک کا سپریم لاء ہو گا اور یوں جن مقاصد کے تحت پاکستان حاصل کیا گیا تھا وہ پورے ہو جائیں گے۔ انہوں نے یہ بھی فرمایا تھا کہ میں نے ایسا کر کے اللہ کے حکم پر عمل کیا ہے اور قرآن میں جو لکھا ہے میں نے پورا کر دیا ہے بہت بڑا دعویٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ البتہ ابتدائی اعلان سے جو کچھ معلوم ہو سکا ہے اس کے تحت کسی مسلمان فرقے کے شخصی قانون کے الفاظ کی عبارت گو وہی مفہوم ہو گا جو اس فرقہ کی طرف سے لیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مذہبی فرقے بدستور قائم رہیں گے۔ نہ صرف قائم رہیں گے بلکہ انہیں اپنے شخصی قوانین کے نفاذ کا بھی پورا اختیار ہو گا اور اس طرح مذہبی فرقے پہلے سے بھی زیادہ مستحکم ہو جائیں گے۔ اعلان میں مذہبی علماء سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ تبلیغ و تلقین سے کام لیکر فرقہ واریت ختم کرائیں۔ حالانکہ مذہبی راہ نماؤں کا تو وجود ہی فرقہ واریت سے قائم ہے۔ بھلا کون اپنے وجود کو خطرے میں ڈالتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ مذہبی راہ نماؤں کے ذریعہ فرقہ واریت ختم ہو جائے گی۔ یہ سب طفل تسلیاں ہیں۔ اسے آپ حکومت کی سادہ لوحی سمجھ لیں یا مذہبی پیشوائیت کی خوشنودی۔ بہر صورت کہنا یہی پڑتا ہے کہ:

ہر اک قدم پہ ٹھوکریں کھانے کے باوجود
کھائے فریبِ وعدۂ باطل جگہ جگہ

جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے اور یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ مجوزہ شریعت مختلف فرقوں (مکاتبِ فکر) کو تسلیم کرتی ہے۔ ہر فرقے کو اس کا الگ شخصی قانون دیتی ہے۔ یہ نہ صرف ضابطۂ خداوندی سے انحراف ہے بلکہ مملکت کے اندر قانون کے الگ الگ ضابطوں کا نفاذ اسلامی نظام کے خلاف بغاوت کے مرادف ہے۔ قرآن اسے جہنم کی تباہی تک پہنچنے کے مختلف راستے قرار دیتا ہے (15:44)۔ اس کے برعکس اقبالؒ کے نزدیک اسلامی مملکت میں قوانین کی بنیاد خدا کی کتاب قرآنِ مجید قرار پاتی ہے۔ جو قوانین اس بنیاد پر مرتب ہو گے ان میں

اختلاف نہیں ہو گا۔ نہ پرسنل اور پبلک لاز کی تفریق ہو گی' نہ فرقوں کی تخصیص۔ ان کا اطلاق تمام فرقوں پر یکساں ہو گا (اقبال اور قرآن ص 144)

ہمارے اکثر کرم فرما اقبالؒ کے تصورِ پاکستان کے تو قائل ہیں۔ لیکن عیسائیوں کی تقلید میں کلیسا کو تخت و تاج سے بالکل الگ مقام دینے کے معتقد ہیں۔ ہماری مذہبی پیشوائیت بھی کلیسا کے اسی نظریہ سے متاثر ہے۔ وہ افرادِ معاشرہ کی پرائیویٹ زندگی کے تمام معاملات اپنی گرفت میں رکھنا چاہتی ہے۔ اس کا خیال یہ ہے کہ پرائیویٹ زندگی کا اجتماعی زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ حالانکہ یہ درست نہیں۔ زندگی ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ جسے شخصی اور پبلک دوائر میں اس طرح تقسیم نہیں کیا جا سکتا کہ ایک دائرے کا اثر دوسرے دائرے پر نہ پڑ سکے۔ ان معاملات کا قوموں کی تمدنی اور پبلک لائف پر گہرا اثر پڑتا ہے چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ کتنی قومیں ایسی تھیں جو ان قوانین کی خلاف ورزی کی بناء پر تباہ ہو گئیں۔ علامہ اقبالؒ ہمارے ان ہمدرد راہ نماؤں میں شمار ہوتے ہیں جو قوم کو ہمیشہ اس حقیقت سے آگاہ کرتے رہے کہ:

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

علامہؒ کا ایک اور عظیم کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس نے قرآن کی روشنی میں امتِ مسلمہ کو اس فراموش کردہ حقیقت کی یاد دلائی کہ اسلام مذہب نہیں دین ہے۔ مذہب خدا اور بندے کے درمیان ایک پرائیویٹ تعلق کا نام ہے۔ جو بندگی' پرستش یا مختلف رسوم کی رو سے انفرادی طور پر قائم ہو جاتا ہے۔ یا بالفاظ دیگر مذہب ان عقائد' نظریات یا رسوم کا مجموعہ ہے جو خود انسانوں نے وضع کئے ہیں۔ ان کا مقصود ہر فرد کی اپنی نجات (مکتی) ہے۔ جو مرنے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ اس میں ملوکیت' سرمایہ داری' مذہبی پیشوائیت' فرقہ بندی' گروہ سازی سب کچھ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس دین ایک اجتماعی نظام کا نام ہے۔ اس اجتماعی نظام کو قائم کرنے کیلئے ایک امت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس پوری امت کا ایمان کے اشتراک کی بناء پر نصب العین بھی ایک ہی ہوتا ہے۔ جسے وحدتِ فکر و عمل کہتے ہیں۔ اس معیار پر حضور نبی کریمؐ نے ایک امت تشکیل کی تھی۔ سوال یہ ہے کہ وہ کونسا نقطۂ اتصال تھا جس نے ان افراد کو ایک امتِ واحدہ کے قالب میں ڈھال دیا۔ بالکل سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کی ان الفاظ میں وضاحت کر دی یعنی اِعْتِصَام بِحَبْلِ اللّٰہ کے معنی اللہ کی رسی کے ہیں اور اس سے مراد خدا کی کتاب قرآن کریم ہے۔ جس کے نفاذ و اجراء کیلئے اللہ تعالیٰ نے حضور نبی اکرمؐ کو مبعوث فرمایا۔ چنانچہ سورہ النساء میں ارشاد ہوا کہ "تیرا رب اس حقیقت پر شاہد ہے کہ یہ کبھی مومن نہیں بن سکتے۔ جب تک ان کی حالت یہ نہ ہو کہ اپنے اختلافی معاملات میں تجھے حکم تسلیم نہ کر لیں اور اس کے لئے ان کی کیفیت یہ ہو جائے کہ ان کے خلاف ان کے دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ ہو۔ یہ اسے بھی بہ طیبِ خاطر قبول کر لیں اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں۔ (4:65)- دوسری طرف حضور نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ "تم ان کے اختلافی معاملات کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کرو" (5:48)- اس وضاحت کے بعد دین میں کسی مذہبی فرقہ کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔

حدیث شریف ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ "تم پر میرے طریقے اور میرے خلفائے راشدین کی پیروی لازم ہے۔ (مشکوۃ باب الاعتصام) یہاں میرے طریقہ سے مراد قرآن کریم ہی کا طریقہ ہے۔ جس کی پیروی لازمی قرار دے دی گئی۔ ارشاد ہوا کہ "اے رسول لوگوں کے سامنے قرآن پیش کیا کرو" (18:27)- آگے

چن کر فرمایا کہ نہ صرف پیش کرو بلکہ "اے نبیؐ خود بھی قرآن کریم کی پیروی کرو" (33:2)- اس سے ایک حقیقت ابھر کر یہ سامنے آئی کہ حضور کا طریقہ قرآن ہی کا طریقہ ہے اور یہی اسلامی نظام کا محور ہے۔

یہاں اس حقیقت کا تذکرہ بے جا نہ ہو گا کہ قرآن کریم ایک متفق علیہ کتاب ہے۔ اس میں کوئی تضاد نہیں۔ اگر یہ خدا کے بجائے کسی اور کا کلام ہوتا تو اس میں بہت سے اختلافات پائے جاتے۔ (4:82)- اس وضاحت کے بعد اگر ہم قرآن و سنت' کی اصطلاح سامنے رکھیں تو اصولی طور پر سنت' کو بھی متفق علیہ ہونا چاہئے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر شخصی قوانین بھی یکساں ہوتے اور پبلک لاز کا بھی متفق علیہ ضابطہ مرتب ہو جاتا ہے لیکن ایسا ممکن نہیں۔ اگر کچھ گنجائش ہوتی تو اس سلسلہ میں مولانا مودودی مرحوم کو یہ اعلان نہ کرنا پڑتا کہ "کتاب و سنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں جو پبلک لاز کے معاملہ میں حنفیوں' شیعوں اور اہل حدیث حضرات کے درمیان متفق علیہ ہو" (ایشیا 23 اگست 1970ء) اور بالآخر تھک ہار کر انہوں نے پاکستان میں فقہ حنفیہ کو اسلامی قوانین کی حیثیت سے نافذ کرنے کا مشورہ دے دیا جس کی تائید بعد میں جناب قاضی حسین احمد صاحب جماعت کے موجودہ امیر بھی کر چکے ہیں۔ ان حالات میں اگر ہم اسلام کا نفاذ چاہتے ہیں تو فرقہ بندی کی لعنت سے بتدریج چھٹکارا لازمی ہو گا۔ بصورتِ دیگر اگر اسلام کے نام پر کچھ نافذ کر دیا گیا تو وہ اور تو سب کچھ ہو گا اسلام ہرگز نہیں ہو گا۔ یہاں اتنی گزارش ضروری ہے کہ مملکتِ خداداد پاکستان یہ تو کر سکتی ہے کہ معاشرہ کے موجودہ حالات کے پیشِ نظر قرآنی احکام و اصول بتدریج نافذ کرے اور اس طرح معاشرہ کو صحیح قرآنی قالب میں ڈھال دے۔ لیکن اسے یہ حق حاصل نہیں کہ وہ بعض احکام تو قرآن سے لے لے اور بعض ان میں انسانوں کے خود ساختہ شامل کر لے۔ یعنی ضابطۂ خداوندی کے ایک حصہ پر ایمان اور دوسرے حصے سے انکار۔ یا پھر حدود کا نفاذ تو مقدم لیکن دیگر شعبہ ہائے حیات مؤخر۔ اسے مانا جائے گا تو سب کا سب مانا جائے گا اور انکار کیا جائے گا تو پورے سے انکار کیا جائے گا۔ ایسا نہیں کہ ضابطہ کا جو حصہ مفید مطلب ہو اس پر عمل اور دوسرے کو نظر انداز کر دیا جائے۔ ضابطۂ خداوندی کے ساتھ یہ سلوک دنیا میں ذلت اور آخرت میں بھی رسوائی کا موجب بنتا ہے (2:85)-

بدقسمتی سے ہماری سب سے بڑی خوش فہمی یا غلط فہمی یہ ہے کہ جس وحدتِ فکر و عمل کے معیار پر حضور نبی اکرمؐ نے ایک امت تشکیل کی تھی۔ ہم نے اسے مختلف مسالک یا مکاتبِ فکر کا نام دیکر پارہ پارہ کر دیا ہے اور اطمینان اس بات پر ہے کہ فرقوں کا نام بدل کر ہم آسانی سے شرک جیسے ناقابل معافی گناہ سے بچ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ سورہ الروم میں ارشاد ہوا کہ (مفہوم) (لہٰذا تم بڑی احتیاط برتنا کہ اس طرح توحید کے پیرو بن کر پھر سے مشرک نہ بن جاؤ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور اس طرح امتِ واحدہ رہنے کے بجائے مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔ فرقوں میں بٹ جانے کے بعد حالت یہ ہو جاتی ہے کہ ہر فرقہ سمجھتا ہے کہ جس طریقے پر ہم چل رہے ہیں وہی حق و صداقت کی راہ ہے۔ اس لئے وہ اپنے آپ میں مگن ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ یاد رکھو فرقہ پرستی اور گروہ بندی شرک ہے۔ تم اس شرک کے مرتکب نہ ہو جانا" (30:32)- یہاں دیکھئے امت کی وحدت ٹوٹنے کو شرک کہا گیا ہے۔ بات واضح ہے جب تک امت ایک ہی فکر و عمل کے تابع رہے تو اس کی وحدت قائم رہتی

ہے۔ تفرقہ کے معنی یہ ہیں کہ مختلف گروہ مختلف اتھارٹیز کے تابع ہو جاتے ہیں۔ اس کا نام شرک ہے۔ اس کی تعبیر میں دوسری جگہ فرمایا "اے رسولؐ ان سے کہہ دو کہ یہ میرا راستہ ہے۔ اسی کو صراطِ مستقیم کہا جاتا ہے۔ تم سب اس کا اتباع کرنا۔ اگر تم نے مختلف راستے اختیار کر لئے تو پھر خدا کی طرف جانے والا راستہ کسی کے سامنے نہیں رہے گا" (6:154)- دوسرے مقام پر نبی اکرمؐ کو مخاطب کر کے فرمایا۔ "جو لوگ دین میں تفرقہ پیدا کر دیں اور خود گروہ بن کر بیٹھ جائیں اے رسولؐ تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں" (6:160)- اسی ضمن میں بہت سی احادیث بھی مل سکتی ہیں۔ جن میں صریحاً کہا گیا ہے کہ امت سے علیحدگی کے معنی دائرہ اسلام سے خارج ہو جانا ہے۔ علامہ اقبالؒ جاوید نامہ میں تشکیلِ امت کے بارے میں فرماتے ہیں :

قوتِ دیں از مقامِ وحدت است
وحدت ار مشہود گردد ملت است

تصریحاتِ بالا کے مطابق دین کا مفہوم کیا ہے یعنی خدا کی کتاب کو ضابطہ حیات تسلیم کرنے کی بناء پر امت واحدہ کی تشکیل۔ اس امت کی ایک مملکت ہو اس مملکت کی ایک اتھارٹی جسے اقبالؒ نے مرکزِ ملت کہہ کر پکارا ہے اور اس پورے نظام کو قرآن مجید نے "الاسلام" کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ ان کی یہی وہ تعبیر اسلام ہے جو تحریکِ پاکستان کے دوران برصغیر کے مسلمانوں کے سامنے پیش کی گئی انہوں نے تسلیم کی اور کامیاب ہوئی۔ نتیجہ پاکستان جیسے ایک عظیم ملک کی شکل میں اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ اس آئینے میں دیکھئے تو اسلام دین کی صورت میں کہیں بھی موجود نہیں۔ پاکستان کے ایک سابقہ صدرِ مملکت جناب غلام اسحٰق نے ایک دفعہ بالکل درست کہا تھا کہ "اس وقت دنیا میں کوئی پچاس سے زائد مسلم ممالک ہیں۔ لیکن ان میں ایک بھی اسلامی ریاست نہیں ہے"۔

اس حقیقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے علامہ اقبالؒ اس نتیجہ پر پہنچے کہ جب تک اسلام کا نظام قائم نہیں ہوتا امت میں وحدت پیدا نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے سوچا کہ اس پروگرام کا آغاز کسی ایسے خطۂ زمین سے ہو سکتا ہے جہاں پہلے سے کوئی مملکت قائم نہ ہو۔ اس کے لئے انہوں نے دینِ اسلام کی تجربہ گاہ کے طور پر مملکتِ پاکستان کا تصور دیا۔ اس تصور کو قائداعظمؒ نے ایک محسوس مملکت میں متشکل کر دیا جہاں علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں اسلام کو اپنی اصلی اور منزہ شکل میں نافذ ہونا ہے۔ بہرحال ہماری تاریخ میں یہ ایک انوکھا انقلاب تھا۔ جس سے پھر اسی دین کے احیاء کے امکانات پیدا ہو گئے۔ جسے صدرِ اول میں ہمارے نبی اکرم ﷺ نے اپنے مقدس ہاتھوں سے قائم کیا تھا۔

آپ اسے مملکتِ پاکستان کا تصور کہہ لیں یا علامہؒ صاحب کا ایک خواب جس کی تعبیر حصولِ مملکت کی حد تک تو درست ہے لیکن ان کی نظروں میں یہ بذاتِ خود مقصد نہیں بلکہ مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ منزل نہیں، منزلِ مقصود تک پہنچنے کا سامان ہے۔ ایک خاکہ ہے جس میں احیائے دین کا رنگ بھرنا ابھی باقی ہے۔ لیکن احیائے اسلام مولانا حضرات کا نہیں۔ اس کے لئے علامہؒ صاحب کی فکر کا سرچشمہ قرآن مجید ہے۔ چنانچہ اس شعر میں ان کے اسی جذبہ کا اظہار ہے۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

دین اور مذہب ان کی نظروں میں دو متضاد مکاتبِ فکر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ساری عمر مذہبی پیشوائیت کے خلاف فکری اور قلمی جہاد میں مصروف رہے۔ "اے کشتۂ سلطانی و ملّائی و پیری" میں اسی فکر سے نبرد آزما نظر آتے ہیں۔

علامہؒ صاحب کے بعد قائداعظمؒ نے بھی اسی تسلسل کو قائم رکھا۔ 1948ء میں اپنے ایک پیغام میں برملا طور پر ایک جرأت مندانہ اعلان کر دیا۔ فرمایا کہ "یہ مسلمہ بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیوکریسی رائج نہیں ہو گی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ بزعم خویش' خدائی مشن کو پورا کریں" افسوس کہ انہیں اپنے تصورات کی تعمیل کیلئے مزید مہلت نہ ملی اور ان کے عزائم ادھورے رہ گئے۔ آج اقبالؒ اور جناحؒ کا پاکستان اسی تھیوکریسی کی زد میں ہے۔ جس سے وہ اسے ہر قیمت پر بچانا چاہتے تھے۔ بہرحال مختلف طالع آزما اپنی اپنی فکر کو لیکر میدان میں اتر آئے ہیں۔ رنگ رنگ کی بولیاں سننے میں آرہی ہیں۔ کوئی سعودی طرز کا اسلام تجویز کر رہے ہیں تو کوئی فقہ حنفیہ آزمانا چاہتا ہے۔ ابھی حال ہی میں مذہب کے ایک ترجمان کا بیان نظر سے گزرا وہ طالبان کے اسلام کو ترجیح دے رہا ہے۔ یہ وہی صاحب ہیں جن کے بزرگ فخریہ کہا کرتے تھے کہ ہم حصولِ پاکستان کے گناہ میں شامل نہیں ہیں۔ اس جمگھٹے میں جو بات ناگوار گذرتی ہے وہ یہ ہے کہ کسی جانب سے بھی صدرِ اوّل کی آواز نہیں آئی۔ کتاب اللہ کی حکمرانی کا ذکر سننے میں نہیں آیا۔ علامہؒ کے سارے تصورات و خطبات پسِ پردہ چلے گئے ہیں۔ زیادہ شور ان مذہبی عناصر کا ہے جنہوں نے تحریکِ پاکستان کی کھلم کھلا یا در پردہ مخالفت کی تھی اور جو اب کسی نہ کسی طرح اپنی دھونس کی بناء پر حکومت سے اپنی مرضی کا اسلام (تھیوکریسی) نافذ کرانا چاہتے ہیں۔ جس کی رو سے اعتقادات' عبادات اور شخصی قوانین مذہبی پیشواؤں کیلئے چھوڑ دیئے جاتے ہیں اور پبلک لاز مغرب کے جمہوری انداز سے وضع ہوتے ہیں۔ ان کا تصورِ اسلام یہی ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے بہتر ہے کہ اس مجوزہ حکومت کا بھی ذکر ہو جائے جو قائداعظم بطور اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ ایک موقع پر فرمایا کہ "اسلامی حکومت کے تصور کا امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہئے کہ اس کی اطاعت اور فرماں برداری کا مرجع خدا کی ذات ہے۔ جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ قرآنِ کریم کے احکام و اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً" نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے' نہ کسی پارلیمان کی' نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی احکام و اصول کی حکمرانی کا نام ہے"۔

قائداعظم پاکستان کے متعلق اپنی کن تمناؤں کی تکمیل چاہتے تھے۔ اس کی ایک جھلک ان کے مندرجہ ذیل اقتباسات میں ملاحظہ فرمائیں۔

30 اکتوبر 1947ء لاہور میں ایک ریلی سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ :

"اگر ہم نے اپنا جذبہ محرکہ اور راہ نمائی قرآن سے حاصل کئے تو میں ایک بار پھر کہوں گا کہ آخری جیت ہماری ہی ہو گی۔ آپ کو پاکستان کو اسلام کا قلعہ بنانے کیلئے سب کچھ قربان کرنے کیلئے تیار رہنا چاہئے"۔
(تقاریر بہ حیثیت گورنر جنرل ص 30)

13 جنوری 1948ء اسلامیہ کالج پشاور میں خطاب۔

"ہم نے پاکستان کا مطالبہ زمین کا ٹکڑا حاصل کرنے کیلئے نہیں کیا تھا بلکہ ہم ایسی تجربہ گاہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ جہاں ہم اسلام کے اصولوں کو آزما سکیں"۔ (کتابچہ قائداعظم کا پیغام ص 99)

12 اپریل 1948ء میں اسی کالج کے طلباء سے خطاب۔

"یاد رکھو ہم ایک ایسی مملکت متشکل کر رہے ہیں جو تمام دنیا کی تقدیر بدلنے میں اہم کردار ادا کریگی"۔ (تقاریر

بہ حیثیت گورنر جنرل ص 112)

24/25 اکتوبر 1945ء قائداعظم کے زیر ہدائت کلکتہ میں جمعیت العلماء کی ایک کانفرنس میں حسبِ ذیل قراردادیں منظور کی گئیں :

(1) تحریک پاکستان کی بنیاد دو قومی نظریہ ہے۔ جو قرآن مجید کا عطا فرمودہ غیر متبدل اصول ہے۔

(2) اگر خدا نے تحریکِ پاکستان کو کامیابی عطا فرمائی تو اس سرزمین میں حضور خاتم النبین ؐ کی طرز پر حکومت قائم ہو گی۔

(3) اکھنڈ بھارت کی سکیم کا مردانہ وار مقابلہ کیا جائے گا اور اسے کسی صورت میں بھی قبول نہیں کیا جائے گا۔

یہ ہیں قیامِ پاکستان سے قبل اور بعد کے کچھ تاریخی اعلانات جو وقتاً فوقتاً قوم کے سامنے پیش ہوتے رہے۔ اگر کوئی منچلا خواہ وہ مولانا ہو یا سیاست دان احیائے اسلام کے سلسلہ میں اب بھی ادھر ادھر دیکھ رہا ہے۔ تو اس کی خدمت میں یہی گزارش ہے کہ :

جنہیں حقیر سمجھ کر بجھا دیا تم نے
وہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہو گی

پیپلز کلیرنگ ایجنسی
کسٹم ھاؤس سے منظور شدہ
کلیرنگ اینڈ فارورڈنگ ایجنٹ
۲۵ سالہ تجربہ کار
کلیرنگ اور فارورڈنگ کے معاملات میں ایک قدم آگے
ہمارے ۲۵ سالہ تجربہ سے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ فائدہ۔
ہم آپکی خدمت کیلئے ہمہ وقت تیار ھیں۔
۵۔ وقار سینٹر، فرسٹ فلور رام بھارتی اسٹریٹ، جوڑیا بازار۔ کراچی
فون : ۲۴۲۶۱۲۸ ۲۴۳۱۰۴۵ - ۲۴۳۷۵۳۷
فیکس نمبر :- ۲۴۱۹۷۸۲
ٹیلیکس : ۲۱۰۴۳ BTC PK

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عبدالرحمان ارائیں

کھلا خط

محترمی و مکرمی جناب ایڈیٹر صاحب
روزنامہ "لشکر" و "اساس" لاہور
السلام علیکم و رحمت اللہ و برکاتہٗ

مؤدبانہ التماس کے ساتھ گذارش ہے کہ آپ کے مؤقر جریدہ کی اشاعت مورخہ 14 نومبر میں علامہ غلام احمد پرویز اور بزم "طلوع اسلام" کویت سے متعلق حکومتِ کویت کے فتویٰ پر مبنی جو خبر شائع ہوئی ہے اس میں حقائق کو صحیح طور پر پیش نہیں کیا گیا۔ اس خبر کی ایک تو رپورٹنگ صحیح نہیں ہوئی اور دوسرا حکومت کے فتویٰ کا غلط مفہوم پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ نہ صرف ہمارے لئے نقصان دہ ہے بلکہ اس سے آپ کے مؤقر جریدے کی ساکھ بھی مجروح ہو گی۔ ہم آپ کے سامنے مندرجہ ذیل میں اس خبر اور فتوے سے متعلق صحیح حقائق پیش کرتے ہیں اور درخواست ہے کہ اسے اپنے مؤقر جریدے کی سب سے پہلی اشاعت میں جگہ دیکر ممنون فرمائیں تاکہ غلط بیانی اور جھوٹے الزامات سے علامہ غلام احمد پرویز صاحب کی روح کو صدمہ ہوا ہو گا اور ادارہ طلوع اسلام لاہور کی شہرت اور نیک نامی کو جو نقصان پہنچا ہے اس کا ازالہ ہو سکے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہمیشہ حق و صداقت کا ساتھ دیں۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ (القرآن) ہم امید کرتے ہیں کہ آپ حق و صداقت کا ساتھ دے کر اللہ اور رسولؐ کی نگاہ میں قابلِ احترام مقام پائیں گے۔

شاید یہ بات آپ کے علم میں ہو کہ علامہ غلام احمد پرویز ایک ممتاز مفکرِ قرآن اور تحریکِ پاکستان کے ہراول دستے کے سپاہی تھے۔ آپ کا شمار قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کے قریبی ساتھیوں میں ہوتا تھا۔ قائداعظمؒ کے ساتھ آپ کے تعلقات کی کیفیت یہ تھی کہ جہاں ہر کسی کو (خواہ وہ کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو) قائداعظمؒ سے ملاقات کرنے کیلئے پروٹوکول کی پابندی کرنی پڑتی تھی وہاں علامہ پرویز کو کھلی اجازت تھی کہ وہ جب چاہیں قائد سے ملاقات کر سکتے ہیں۔ قائداعظمؒ اور علامہ پرویز کے باہمی تعلقات کی گہرائی کا اعتراف قائداعظمؒ کے ہر ساتھی نے کیا ہے۔ اس گہرے تعلق کی ایک وجہ یہ تھی کہ قائداعظمؒ کو قرآن سے والہانہ لگاؤ تھا اور آپ علامہ پرویز کی قرآنی بصیرت سے بے حد متاثر تھے۔ علاوہ ازیں قائداعظمؒ علامہ پرویز کی تحریکِ پاکستان کیلئے جدوجہد کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ علامہ اقبالؒ نے جب دو قومی نظریہ پیش کیا تو علمائے ہند کی اکثریت نے اس نظریے کی شدید مخالفت کی۔ علامہ اقبالؒ نے 1938ء میں سید نذیر نیازی کی زیر ادارت مجلّہ "طلوعِ اسلام" کا اجراء کیا تاکہ مولویوں کے اعتراضات کا جواب دیا جا سکے۔ کچھ عرصہ بعد اس مجلّے کی ادارت علامہ پرویز کے سپرد کر دی گئی۔ اس مجلّے کا مقصد نظریہ پاکستان کا قرآنِ کریم کی روشنی میں دفاع کرنا تھا۔

علامہ پرویز نے مولویوں کے اعتراضات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور انہیں ہر محاذ پر شکست دی۔۔ اس لڑائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولوی علامہ پرویز کے سخت دشمن بن گئے اور یہ دشمنی آج تک چلی آرہی ہے۔ مولویوں کی یہ پرانی عادت ہے کہ جب بھی ان سے بات بن نہیں پاتی تو یہ کفر کا فتویٰ صادر کر دیتے ہیں یہ ان کا نہایت مہلک ہتھیار اور آخری حربہ ہوتا ہے کیونکہ اس کے بعد یا تو فریقِ مخالف ختم ہو جاتا ہے یا یہ خود سسک سسک کر دم توڑ دیتے ہیں۔ جب مولوی حضرات نظریۂ پاکستان پر حملہ آور ہوتے تو پرویز صاحب اس کا جواب قرآنی دلائل کے ساتھ دیتے جن کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا تھا۔ اس ناکامی کی خفت کو مٹانے کیلئے پھر انہوں نے تابڑ توڑ فتوے داغے' قائداعظمؒ کو کافراعظم کہا اور علامہ اقبالؒ کو ملحد و مرتد قرار دیا لیکن ان کی ایک تدبیر بھی کارگر ثابت نہ ہوئی۔۔ علامہ پرویز کی ان تھک محنت اور تدبر و فراست کی بناء پر انہیں ہر محاذ پر شکست ہوئی اور ان کی ہر مخالفت دم توڑ گئی اور جب پاکستان بن گیا تو ان کی اکثریت یہاں آگئی اور "طلوعِ اسلام" کیلئے پھر سے دردِ سر بن گئی۔ طلوعِ اسلام' جس کی بنیاد علامہ اقبالؒ نے رکھی تھی اور جسے علامہ پرویز نے پروان چڑھایا آج ایک تناور درخت بن چکا ہے۔

آپ تو جانتے ہیں کہ مولویوں کا تعلق ایک ہی نسل سے ہوتا ہے۔ مولوی پاکستان کا ہو یا باہر کا' ماضی کا ہو یا حال کا' درشت مزاجی اور تنگ نظری کے لحاظ سے سب ایک جیسے ہیں۔ یہ سب "طلوعِ اسلام" کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے ہیں۔ کویت میں "طلوعِ اسلام" کو بدنام کرنے کیلئے انہوں نے ہر حربہ استعمال کر کے دیکھ لیا لیکن اس کی مقبولیت کو کم نہ کر سکے۔ انہوں نے طلوعِ اسلام کے خلاف پمفلٹ تقسیم کئے' اخبارات میں شرانگیز خبریں چھپوائیں حتیٰ کہ جمعتہ المبارک کے خطبوں میں (جو کہ خالص مذہبی نوعیت کے ہونے چاہئیں) بھی طلوعِ اسلام کے خلاف زہر افشانی کی۔ یہ سب کچھ کرنے کے باوجود "طلوعِ اسلام" کو شکست نہ دے سکے۔ "طلوعِ اسلام" نے ان کا ہر وار صبر و تحمل سے برداشت کیا اور اپنی رفتار میں کمی نہیں آنے دی۔ جب ان کی ہر کوشش ناکام ہو چکی اور ہر طرف سے مایوسی اور شکست کا سامنا کرنا پڑا تو اب یہ فتوے کا سہارا لے رہے ہیں۔ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ یہ ان کا آخری حربہ ہوتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ان کے اس وار سے بھی محفوظ رکھے گا اور ہم سرخرو ہوں گے۔

پاکستانی مولویوں نے کیا یہ ہے کہ کویت کی وزارتِ اوقاف کے سامنے علامہ پرویز اور "طلوعِ اسلام" پر چند جھوٹے' من گھڑت اور بے بنیاد الزامات عائد کر کے فتویٰ طلب کیا اور ان خدا کے بندوں نے بلاتفتیش اور بلاتحقیق طلوعِ اسلام کو صفائی کا موقعہ دیئے بغیر فتویٰ صادر کر دیا۔ ہم حیران ہیں کہ کیا عدل و انصاف کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ ایک غیر ذمہ دار شخص کی غیر مصدقہ اطلاع پر بغیر تفتیش کے دوسرے کو واجب القتل قرار دیا جائے؟ مذکورہ فتویٰ میں جن جن الزامات کا ذکر ہے وہ بے بنیاد اور من گھڑت ہیں۔ "طلوعِ اسلام" کا ان سے دُور کا واسطہ بھی نہیں اور وہ ان کی سختی سے تردید کرتا ہے۔ علامہ پرویز کی فکر سے کسی کو ہزار اختلاف سہی لیکن یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ وہ پکے اور سچے مسلمان تھے۔ آپ سُنّی العقیدہ حنفی مسلک سے تعلق رکھتے تھے پانچ وقت کے نمازی' ماہِ رَمَضَانْ کے کامل روزے رکھنے والے' عمرہ' حج' زکوٰۃ کے متعلق بعینہٖ وہ عقیدہ جو امت کی اکثریت کا ہے' اللہ' آخرت' ملائکہ' انبیاء اور کتب کی حقانیت اور وجود پر قرآن و سنت کے مطابق ایمان' اطاعتِ

رسولؐ اور احادیث نبوی کے عظیم علمبردار، ناموسِ رسالت کے محافظ اور ختم نبوّت کے مجاہدِ اوّل تھے۔ ایسے عظیم فرزندِ اسلام کے ایمان و صدق پر شک کرنا، کفر و الحاد کے فتوے لگانا اور واجب القتل قرار دینا انتہائی ناانصافی اور صریح ظلم ہے۔

یہ ہماری انتہائی بدنصیبی ہے کہ ہم بلاتحقیق جھوٹے الزام لگا کر دوسروں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیتے ہیں۔ خدا اور رسولؐ کے احکام کو فراموش کر کے ذرہ بھر خوف نہیں کھاتے کہ یہ زندگی تو عارضی ہے آخرت میں ہم کیا جواب دیں گے۔ خدا اور رسولؐ کا حکم تھا کہ بلاتحقیق کوئی بات نہ قبول کیا کرو اس لئے کہ قیامت کے روز تم سے اس کی بابت باز پرس ہو گی۔ (القرآن) لیکن ہم ہر بات بلا سوچے سمجھے کہہ دیتے ہیں اور بلاتحقیق قبول کر لیتے ہیں اور ہمیں بالکل ملال نہیں ہوتا۔ ہمیں خدا اور رسولؐ سے یہ بھی حکم ملا تھا کہ جب انصاف کا معاملہ ہو تو دشمن سے بھی انصاف کرو کیونکہ انصاف تمہیں تقویٰ کے قریب تر کر دیگا (القرآن) لیکن ہماری کیفیت یہ ہے کہ دشمن تو رہے ایک طرف ہم اپنے بھائی بندوں سے بھی ناانصافی کرتے ہیں۔ فتویٰ زیرِ نظر میں ان دونوں قرآنی احکام کی خلاف ورزی ہوئی ہے۔فتویٰ صادر کرنے سے پہلے نہ تو کوئی تحقیق ہوئی اور نہ ہی انصاف کے تقاضوں کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ تحقیق و انصاف کا تقاضا تھا کہ "طلوعِ اسلام" کا نقطۂ نظر براہِ راست معلوم کیا جاتا، لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ طلوعِ اسلام اس غیر معقول اور مبنی برظلم فیصلے کی شدید مذمت کرتا ہے واضح رہے کہ حکومتِ کویت کے آئین کے مطابق اس فتویٰ کی کوئی قانونی حیثیت نہیں۔ کویت ایک بین الاقوامی شہر کی خصوصیت کا حامل ہے۔ یہاں طرح طرح کے عقائد و نظریات کے لوگ آباد ہیں اور سب کویت کی تعمیر و ترقی میں مشغول ہیں۔ فتوے صادر کرنا مولویوں کا مرغوب مشغلہ ہے۔ جو بھی ان سے اختلاف رائے رکھتا ہے اسے خدا اور رسولؐ کا منکر قرار دے دیتے ہیں۔ ایسا چودہ سو سال سے ہو رہا ہے اور اس فتویٰ بازی کی رو سے آج پورے عالم اسلام میں ایک بھی مسلمان ایسا نہیں جس پر فتویٰ نہ ہو۔ یہاں کا عدالتی نظام بڑا مستحکم اور مبنی برانصاف ہے۔ ہر فیصلہ قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ بزمِ طلوع اسلام کویتؔ کو اس جھوٹے فتویٰ سے اذیت ضرور ہوئی ہے لیکن اس کی سرگرمیوں پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ اس کے پروگرام حسبِ معمول جاری ہیں۔ مذکورہ بالا خبر میں چند مزید باتیں بھی غلط بیان ہوئی ہیں مثلاً" کہا گیا ہے کہ سعودی عرب کے مفتی شیخ بن باز نے بھی "طلوعِ اسلام" اور علامہ پرویز کے خلاف فتویٰ دیا ہے یہ صریح جھوٹ ہے اور یہ بھی جھوٹ ہے کہ یہاں پاکستانیوں کو اس فتویٰ سے خوشی ہوئی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہاں کے تعلیم یافتہ طبقے کی اکثریت نے اس کی مذمّت کی ہے۔ یہ پاکستانی کمیونٹی میں نفرت پھیلانے کے مترادف ہے جو کہ کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ خبر میں بزم کویت کے نمائندہ عبید الرحمان ارائیں کا نام بھی مذکور ہے جب کہ فتویٰ میں ان کا نام نہیں لیا گیا۔ اس غلط بیانی سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے عزائم کیا ہیں؟ یہ لوگ مذہب کے لبادے میں سستی شہرت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ "طلوعِ اسلام" کو کویت میں جو شہرت اور عزّت حاصل ہو چکی ہے اس سے ان کے سینوں میں حسد کی آگ بھڑک اٹھی ہے اور یہ اوچھے ہتھکنڈے استعمال کر کے اس انسانیت ساز تحریک کا گلا گھونٹنا چاہتے ہیں۔ جس میں یہ کبھی کامیاب نہیں ہونگے۔

"طلوع اسلام" نے خدا اور رسولؐ کا دامن تھام رکھا ہے۔ اس کا ہر کارکن اللہ' آخرت' ملائکہ' انبیاء اور کتب پر اٹل ایمان رکھتا ہے اور جملہ ارکانِ اسلام بشمول پانچ وقتہ نماز' ماہ رمضان کے کامل روزے' حج اور زکوٰۃ پر خود بھی عمل کرتا ہے اور دوسروں کو بھی عمل کی تلقین کرتا ہے اس کے نزدیک اطاعتِ رسولؐ فریضۂ خداوندی کے مترادف ہے اور ہر اس حدیث کو صحیح تسلیم کرتا ہے جو قرآن کے معیار پر پورا اترتی ہے لہٰذا اس پر الزامات عائد کر کے کافر و مرتد قرار دینا انتہائی ظلم اور ناانصافی ہے۔

جناب والا! ہم آپ کو اعلیٰ اقدار کے پاسبان' جمہوریت اور تکریمِ انسانیت کے محافظ اور حق و صداقت کے علمبردار سمجھتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ کو غلط معلومات فراہم کی گئی ہیں اور آپ کے مؤقر جریدے کی ساکھ کو نقصان پہنچایا گیا ہے۔ "طلوعِ اسلام" کے ساتھ صریح ظلم اور ناانصافی ہوئی ہے لہٰذا آپ کا اخلاقی فریضہ ہے کہ آپ ہماری ان گذارشات کو اپنے مؤقر جریدے میں بھرپور کوریج دیں اور ہمیں ممنون ہونے کا موقع فراہم کریں۔

والسلام' مخلص
عبدالرحمان ارائیں
نمائندہ بزم "طلوع اسلام" کویت
(بشکریہ روزنامہ "اساس" 12 دسمبر 1998ء)

روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی/اسلام آباد 11 دسمبر 1998ء میں شائع ہونیوالی ایک خبر:-

طلوع اسلام اتحاد بین المسلمین کیلئے بہترین کردار ادا کر رہا ہے: عنایت علی شاکر

راولپنڈی (پ ر) عالم اسلام کے اتحاد اور کامیابی کے لئے امیر کویت اور وزیراعظم کویت کی کوششیں قابل تحسین ہیں۔ پاک کویت اسلامی برادرانہ تعلقات تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ طلوع اسلام اتحاد بین المسلمین کے لئے بہترین کردار پیش کر رہا ہے۔ ان خیالات کا اظہار تحریک اخوت اسلامی پاکستان کے چیئرمین علامہ عنایت علی شاکر نے کویت میں اپنے دورہ کے دوران کویت میں طلوع اسلام کے نمائندہ جناب عبدالرحمان ارائیں کی طرف سے اپنے اعزاز میں ایک عشائیہ سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انہوں نے کہا کہ آزادی کویت کے بعد کویتی عوام نے امیر کویت شیخ جابر الاحمد الصباح اور ولی عہد کویت جناب فضیلت ماب الشیخ سعد عبداللہ سالم الصباح کی قیادت میں جس جرات اور بہادری اور بلند حوصلے کا ثبوت دیا پوری دنیا انہیں خراج تحسین پیش کرتی ہے۔

رمضان المبارک میں لاہور کی مساجد کے لئے
بزم طلوع اسلام لاہور کا تحفہ
انتظامیہ/امام مسجد خط لکھیں
معریٰ قرآن کریم کے خوبصورت نسخے/پارے ہم آپ کے ساتھ
سعادت نماز کے بعد پیش کریں گے۔
پتہ:- بزم طلوع اسلام B-25' گلبرگ 2' لاہور۔

وہ کون سا دماغ ہے ـــــ

جس میں ـــ اِس قِسم کے سوالات نہیں اُبھرتے کہ :

- کیا انسان کی قسمت پہلے سے لکھی ہوتی ہے ؟ ○ کیا سب کچھ خُدا کی مرضی سے ہوتا ہے ؟
- کیا غریبوں کی قسمت ہی ایسی ہے کہ وہ ساری عُمر دھکے کھاتے رہیں؟ ○ کیا خُدا کو ایسا ہی منظور ہے؟
- کیا موت کا ایک دن مقرر ہے یا وہ آگے پیچھے بھی ہو سکتی ہے ؟
- بعض بچے پیدائشی اندھے، لُولے، لنگڑے کیوں ہوتے ہیں ؟ کیا یہ بھی خدا کی مرضی سے ہوتا ہے ؟
- اگر خُدا کے ہاں عدل ہے تو وہ ظالموں کو ظلم سے کیوں نہیں روکتا ؟
- کیا دُعا سے تقدیر بدل جاتی ہے ؟ اگر نہیں بدلتی تو ہم دُعا کیوں کرتے ہیں ؟

یہ، اور اِسی قِسم کے دیگر سوالات کا تعلق **مسئلۂ تقدیر** سے ہے جس نے انسانی ذہن کو ہمیشہ طلسمِ پیچ و تاب بنائے رکھا ہے۔

یہی وہ مسئلہ تھا جس کو صحیح طور پر نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے **کارل مارکس** نے کہہ دیا کہ :

مذہب عوام کے لیے افیون ہے

جنابِ **پرویز** نے ـــــ دُنیا کے اِس مُشکل ترین مسئلہ کو ـــــ اپنی تصنیف

کتاب التقدیر

میں قرآنِ کریم کی روشنی میں اس عُمدگی سے حل کر دیا ہے کہ اس کے بعد ذہن میں کوئی خلجان باقی نہیں رہتا۔

ـــــ قیمت : سٹوڈنٹ =/120 - اعلیٰ =/240

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈاکٹر محمد معروف

علامہ اقبالؒ اور قرآن حکیم

(یہ مقالہ ایوانِ اقبال میں منعقدہ سیمینار بعنوان "اقبال اور قرآن" میں یکم نومبر 1998ء کو پڑھا گیا۔ مدیر)

آج کا موضوع ہے "علامہ اقبالؒ اور قرآن حکیم" جو انتہائی وسیع و عریض ہے۔ ایک طرف قرآنِ حکیم جس میں تقریباً ہر موضوع پر بنیادی اصول اور تشریح پائی جاتی ہے تو دوسری طرف فکر اقبالؒ جو بیشمار پہلوؤں پر محیط ہے۔ لہٰذا اس قلیل مدت میں اور ان چند صفحات میں ان سب پر بحث کرنا ممکن نہیں۔ چنانچہ میں نے آج کی اس محفل کیلئے فکرِ اقبال سے دو نہایت اہم موضوعات بحث کیلئے چنے ہیں۔ اور وہ ہیں "اقبالؒ کا فلسفۂ خودی" جو علامہ کا اہم ترین تصور ہے اور جس پر انہوں نے سیر حاصل بحث کی ہے۔ اور دوسرا "علامہ اقبالؒ کا نظریۂ علم" جو میری نظر میں ان کے نظام فکر کی اساس فراہم کرتا ہے۔ چنانچہ ان چند صفحات میں جو آپ کے روبرو پڑھنے جا رہا ہوں میں نے ان دو موضوعات پر بحث کی ہے اور ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ علامہ اقبالؒ اپنے فکر کی تشکیل میں قرآنِ حکیم کی حکمت اور دانائی سے کس حد تک متاثر ہوئے ہیں۔ میرے تجزیہ کے مطابق اقبالؒ نے اپنے تمام تر فلسفہ کی بنیاد قرآنی حکمت پر رکھی۔ اور یہی چیز ان کے مشہورِ زمانہ خطبات کے عنوان یعنی

The Reconstruction of Religious Thought in Islam

سے واضح ہوتی ہے۔ آج کے اس مقالہ میں میرا بنیادی مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

علامہ اقبالؒ کا فلسفہ خودی

علامہ اقبالؒ نے انڈین اینٹی کولیری۔ بمبئی میں ستمبر 1900ء کو ایک مضمون بعنوان "The Doctrine of Absolute Unity As Expounded by Abdul Karim al-Jilani" چھپوایا۔ اس مضمون سے علامہ اقبال کے فلسفۂ خودی کی ابتدا ہوئی۔ اس میں انہوں نے عبدالکریم الجیلی کی مشہور تصنیف الانسان الکامل پر مبنی انسانِ کامل (Perfect Man) کا تصور پیش کیا۔ اس مضمون کا تمام تر رجحان وحدت الوجودی ہے۔ لیکن یہ علامہ اقبالؒ کے فکر کا ابتدائی زمانہ تھا۔ تاہم اس میں دو تصورات جلال (Writh) جمال (Beauty) ایسے ہیں جو آخر تک علامہ کے فلسفہ خودی کے اہم ترین اجزاء رہے۔ ایک عمومی غلط فہمی کہ اقبال نے انسانِ کامل کا نظریہ مشہور جرمن فلسفی نطشے سے لیا' کی اسی بات سے نفی ہو جاتی ہے کہ موخر الذکر Perfect Man میں صرف جلال ہی جلال ہے جمال کیلئے کوئی جگہ یا گنجائش نہیں۔ کیونکہ اس کے فلسفہ میں رحم' عشق اور نرم روی کیلئے کوئی جگہ نہیں۔ جبکہ اقبالؒ کے مردِ مومن کی فطرت میں یہ لازمی عناصر ہیں۔ چنانچہ مردِ مومن کے بارے میں انہوں نے کہا۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

جو کہ اس آیت کریمہ کا براہ راست ترجمہ ہے۔

اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ

(سورۃ المائدہ' 54)

مردِ مومن کا یہ تصور نطشے کی فہم و فراست سے باہر تھا۔

نطشے نے جو تصور Perfect Man کا اپنی مشہور زمانہ تصنیف Thus Spok Zarathustra میں دیا۔ اس میں اس کا انسانِ کامل صرف ایک ہی قدر سے واقف ہے اور وہ ہے طاقت (Power)- اس کے انسانِ کامل کی علامتیں ایک زہریلی ناگن اور شکرا ہے۔ جو حسد' بغض' نفرت اور تباہی کی نشانیاں ہیں۔ جبکہ علامہ اقبالؒ کے نزدیک مردِ مومن کی ایک ہی علامت شاہین ہے جو بلند پروازی کی نشانی ہے۔ کوئی مستقل آشیانہ یا مسکن نہیں بناتا اور وہ حسد' بغض اور نفرت جیسے حقیر جذبات سے پاک ہے۔ چنانچہ دونوں فلسفیوں کے انسانِ کامل کے تصور میں بنیادی اور نمایاں اختلافات پائے جاتے ہیں۔ نطشے کا انسانِ کامل Sadist ہے جو چھوٹی چھوٹی مخلوق کو نقصان پہنچا کر لطف اندوز ہوتا ہے۔ جبکہ اقبالؒ کا مردِ مومن رحم اور درگذر کے اعلیٰ جذبات سے مزین ہے۔ دراصل اقبال کے تصور کی بنیاد قرآنِ حکیم میں مردِ مومن کی دی گئی صفات پر استوار ہے۔ ان کے نزدیک مردِ مومن کی بہترین مثال خود حضرت محمد ﷺ کی ذاتِ پاک ہے۔ اگر مجھے کہا جائے کہ میں علامہ اقبالؒ کے مردِ مومن کی تشریح ایک فقرے میں کروں تو میں ان کا مندرجہ ذیل مصرعہ پیش کردونگا۔

خودی کا سرِّ نہاں لا الہ الا اللہ

یعنی خودی کی اساس توحیدِ الٰہی پر ہے۔ انسان کی شخصیت مختلف احساسات و جذبات' تصورات و خیالات اور جبلّات پر مبنی ہے۔ لیکن ان تمام عناصر میں ترتیب اور ترکیب کے بغیر خودی کا تصور ممکن نہیں۔ چنانچہ مندرجہ بالا مصرع میں اسی ترتیب و ترکیب کی اشدّ ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ جب تک شخصیت پورے طور پر مرکوز و مرتب نہیں ہوتی اسے خودی کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ چنانچہ علامہ اقبالؒ نے فلسفہ وحدت الوجود کو مکمل طور پر رد کر دیا۔ اور خودی کی تشکیل کو اپنی خوبصورت مثنوی جاوید نامہ میں ان اشعار میں یوں پیش کیا۔

شاہدِ ثالث شعورِ ذاتِ حق
خویش را دیدن بنورِ ذاتِ حق
پیشِ ایں نورِ اربمانی استوار
حیّ و قائم چوں خدا خود را شمار

در حضورش کس نماند استوار
ور بماند ہست او کامل عیار

(کلیات اقبال (فارسی)- ص 20-19)

علامہ نے ان اشعار کا انگریزی ترجمہ اپنے خطبات The Reconstruction of Religious Thought in Islam کے اختتام پر دیا ہے۔ اور اپنے بین الاقوامی خطبہ "Is Religion Possible" میں پرزور انداز میں خودی کی نوعیت کو یوں بیان کیا ہے۔

"The end of the egoes quest is not emancipation from the limitations of individuality, it is, on the other hand, a more precise definition of it. The final act is not an intellectual act, but a vital art which deepens the whole being of the ego, and sharpens

his will with the creative abburance that the world is not something, to be merely seen or known through concepts, but something to be made and re-made by continuous action --- (p.198)

خطبات کے یہ اختتامی فقرات بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ کیونکہ ان میں ایک طرف تو عمل (deed) پر زور دیا گیا ہے اور دوسری طرف تسخیرِ کائنات کا سبق ملتا ہے۔ جو دونوں قرآن حکیم سے ماخوذ ہیں۔ علامہ خطبات کے پیش لفظ کی ابتدا اس جملے سے کرتے ہیں۔

"The Quran is a book which emphasizes deed rather than "Idea"--- (p.v)

اقبالؒ کا نظریۂ علم :

یونانی فلسفہ کی اساس عقلیت پسندی پر تھی۔ اور علم کا ذریعہ صرف اور صرف عقل ہی تھا۔ یونانی فلسفیوں نے ادراک اور حواس کو بطور علم کے منبع کے یکسر رد کر دیا تھا۔ یہی رجحان ہمیں رومی عیسائیت میں نظر آتا ہے۔ چنانچہ صدیوں تک ہمیں عقلیت پسندی ہی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ اس کے برعکس دنیائے جدید میں ہمیں تجربیت کا دور دورہ نظر آتا ہے۔ چنانچہ فلسفہ جدید میں علم کے منابع حواس اور عقل ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے قرآن حکیم کی روشنی میں علم کے مندرجہ ذیل تین منابع تسلیم کئے ہیں۔

1- وجدان یا وحی
2- قدرت یا حواس
3- تاریخ

علامہؒ نے بڑے خوبصورت الفاظ میں لکھا۔

The birth of Islam.. is the birth of inductive intellect یعنی مغرب نے حواس اور ادراک کی اہمیت اور ضرورت اسلام سے سیکھی۔

قرآن مجید نے مشاہدے اور تجربے کی ضرورت پہ ازحد زور دیا۔ میں یہاں بیسیوں آیات میں سے مندرجہ ذیل آیت کریمہ کا ایک حصہ رقم کرتا ہوں۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ .....

وَتَصْرِيفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۝

ان آیاتِ کریمہ کی روشنی میں مسلمان فلاسفہ اور سائنس دانوں نے سائنسی منہاج (Scientific Method) کی بنا رکھی۔ جو بعد میں یورپ کے علماء نے سپین کی یونیورسٹیوں سے حاصل کی۔ مشہور جرمن محقق ڈاکٹر براغالٹ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب Making of Humanity میں کہا ہے۔

"For although there is not a single aspect of European growth in which the decisive influence of Islamic Culture is not traceable, nowhere it is so clear and momentous as in the genesis of that power which constitute the permamnent distinctive force of the modern world, and the supreme source of its victory -- natural science and the scientific spirit' -- That Spirit and those methods were introduced into the European world by the Arabs'.-(p.190)

چنانچہ تجربی علوم اور سائنسی منہاج جس پر آج مغرب کو ناز ہے درحقیقت مسلمانوں ہی کا عطیہ ہے۔

علم پر بحث کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ مندرجہ ذیل آیتِ کریمہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَ الظَّاهِرُ وَ الْبَاطِنُ وَ.....
سورۃ الحدید : 3)

اس آیت کریمہ کے مطابق حقیقت کا ایک خارجی اور ایک داخلی پہلو ہے۔ مشاہدہ، تجربہ اور سائنس ہمیں خارجی پہلو سے تو واقفیت عطا کر سکتے ہیں۔ لیکن داخلی پہلو کیلئے ہمیں وحی اور وجدان کا راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے جسے مغرب یکسر نظر انداز کر چکا ہے۔ چنانچہ علامہ اقبالؒ کے مطابق ہمیں عقل اور وجدان ہر دو کی ضرورت ہے تاکہ ہم حقیقت کے متعلق مکمل علم حاصل کر سکیں۔

علامہ اقبالؒ کو مشرق اور مغرب دونوں سے گلہ ہے کیونکہ دونوں یکطرفہ ہیں۔ چنانچہ وہ جاوید نامہ میں رقمطراز ہیں۔

غربیاں را زیرکی سازِ حیات
شرقیاں را عشق رازِ کائنات
زیرکی از عشق گردد حق شناس
کارِ عشق از زیرکی محکم اساس
عشق چوں بازیرکی باہم شود
نقشبندِ عالمِ دیگر شود

پس علامہ قرآنِ حکیم کی روشنی میں اس ضرورت پر زور دیتے ہیں کہ عقل اور وجدان دونوں کا امتزاج نہایت ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر حقیقت کو نہیں پایا جا سکتا۔

مندرجہ بالا چند صفحات میں میں نے فکر اقبالؒ کے چند گوشوں پر بحث کی ہے۔ اقبالؒ کے فکر کے مطالعہ سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ انہوں نے اپنے کلام میں اور اپنے خطبات میں قرآنِ حکیم کی آیات کی تشریح پیش کی ہے۔ اور انہیں ایک مرتب نظریہ کی شکل دی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے مشہور خطبات کو The Reconsturction of Religious Thought in Islam کا عنوان عطا کیا۔ اس کے بعد علامہ ایک کتاب بعنوان Introduction to the Study of Islam تصنیف کرنا چاہتے تھے۔ اور اس کا خاکہ بھی انہوں نے تیار کر لیا تھا۔ لیکن صحت اور زندگی نے وفا نہ کی۔ اس کتاب میں وہ یقیناً اسلام کی مزید تشریح کرنے کی سعی کرتے۔ بہرحال میں اس نتیجہ پر پہنچتا ہوں کہ علامہ اقبالؒ نے اپنے فکر کو ترتیب دینے میں تمام تر ہدایت قرآن حکیم سے اخذ کی ہے۔ اور ان کا فلسفہ عین قرآنِ حکیم کے مطابق ہے۔

ایک اہم سوال!

قانون استحقاق کیا ہے؟ اور پاکستان میں اسے کیسے نافذ کیا جا سکتا ہے۔ "**الراسخون فی العلم**" سے استدعا ہے کہ وہ اپنے روشن تاثرات سے آگاہ فرمائیں۔ والسلام

ملک حنیف وجدانی

صدر باغبان ایسوسی ایشن، معرفت P.O موہڑہ سیداں، مری

اِسلام — مذہب نہیں

دِین ہے۔ یعنی نظامِ حیات جو ایک آزاد مملکت میں پروان چڑھتا ہے۔
اس نظام کی تشکیل کا آغاز عہدِ نبوی میں ہوا لیکن وہ اپنے عَہدِ شباب تک

خلافتِ فاروقیؓ

میں پہنچا۔ اسلام کو بحیثیت ایک نظامِ حیات دیکھنے کے لیے اُس عہد کی صحیح تصویر کا سامنے آنا ضروری ہے۔ اسے پرویز صاحب نے اپنی مُدت العمر کی تحقیق و کاوش کے بعد اپنی

عَظِیم تصنیف

شاہکارِ رسالتؐ

میں پیش کیا ہے۔ اِس کے آخری باب میں یہ بتایا گیا ہے کہ

عہدِ فاروقیؓ کے بعد اسلام پر کیا گزری؟

اور وہ کس طرح دین سے موجودہ مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ اس کتاب نے ہماری فکری دُنیا میں
اِنقلاب پیدا کر دیا ہے

بڑی ضخیم کتاب ہے — قیمت : ۷۵/- روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بر حفیظ (لاہور)

اقبال اور قرآن

(اقبالؒ کا نظریہ عقل و عشق بحوالہ قرآن)

(یہ مقالہ ایوان اقبال میں منعقدہ سیمینار کے سلسلہ میں طلباء و طالبات سے موصول ہونے والے مقالات میں سوئم قرار پایا۔ مدیر)

علامہ اقبالؒ کا شمار ممتاز حامل دین مفکروں میں ہوتا ہے۔ ان کا فلسفہ ہمہ گیر نوعیت کا ہے۔ انہوں نے نفس کی اتھاہ گہرائیوں سے لے کر کائنات کی بلندیوں اور وسعتوں میں اپنی بصیرت سے نئے افکار تخلیق کئے اور ایک مکمل فلسفہ پیش کیا۔ اقبالؒ کی فکر کا مآخذ و منبع قرآن کریم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ فلسفیانہ اشعار کہتے ہیں تو بات خالی فلسفے کے مقابلے میں زیادہ دل نشیں اور یقین آفریں بن جاتی ہے۔

اقبالؒ قرآن کریم کو ایک مکمل کتاب سمجھتے ہیں۔ ان کے نظریات و افکار ہمیں قرآن کا آئینہ معلوم ہوتے ہیں۔ اقبالؒ کے مطابق قرآن بھی ماہیت حیات اور نفس انسانی کی طرح اپنے اندر لامتناہی زندگی رکھتا ہے۔ انسانی زندگی کے مزید ارتقاء میں کوئی دور ایسا نہیں آسکتا جس میں قرآنی حقائق کا نیا انکشاف ترقی حیات میں انسان کی رہبری نہ کر سکے۔ زندگی کی نوبہ نو صورتیں پیدا ہوتی جائیں گی لیکن قرآن کے اساسی حقائق کبھی دفتر پارینہ نہ بنیں گے۔ اقبالؒ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں:

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

قرآن اور اسلام کے زیر اثر اقبالؒ نے اساس اسلام، مرد مومن، طرز حیات، حیات بعد الموت، فکر و عمل اور فکر و عشق جیسے کئی موضوعات کی توجیہات پیش کی ہیں۔ فلسفہ کی طالب علم ہونے کے ناطے میرا خاص موضوع "خرد و عشق" ہے۔

اقبالؒ ایک مفکر ہے۔ ایک فلسفی یا مفکر وہ ہوتا ہے جو اپنی خاص فکر اور مخصوص طرز فکر کے حوالے سے انفس و آفاق کی طرف نظر کرتا ہے اور اس کی توجیہہ پیش کرتا ہے۔ اس میں اسرار کائنات اور رموز حیات کو جان لینے کی تڑپ ہوتی ہے۔ وہ سائنسی اور منطقی بنیادوں پر اس کا علم حاصل کرتا ہے۔

اقبالؒ ایک شاعر ہے۔ اور شاعری منطق کی پابند نہیں ہوتی۔ شاعری کا سرچشمہ وجدان، تاثرات اور جذبات ہیں۔ یہ فلسفیانہ استدلال سے پیدا نہیں ہوتی۔ ایک شاعر ایک عاشق ہوتا ہے۔ اور عشق اس کے دل پر پوری طرح قابض ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ اس کے قلب و نظر کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

جہاں اقبالؒ کی پردرد شاعری اور فلسفیانہ فکر کا حسین امتزاج ہوتا ہے وہاں ان کی شخصیت کا ایک منفرد پہلو ہمارے سامنے آتا ہے۔ ایک طرف فلسفیانہ فکر سراپا عقل اور دوسری طرف عشق سراپا دل، ان دونوں میں ہمیں باہم پیکار نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری کا بڑا حصہ فلسفیانہ شاعری ہے۔ جہاں کہیں دماغ دل کی تائید کرتا ہے اور کہیں دونوں حریف نظر آتے ہیں۔ اقبالؒ مدت تک اسی کشمکش میں مبتلا رہے۔ کبھی وہ عقل سے اسرار

حیات کی گرہ کشائی میں کوشاں رہے اور کہیں اس سے مایوس ہو کر اور بیزار ہو کر عشق و وجدان کی طرف گریز کرتے ہیں۔

اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز وسازِ رومی' کبھی پیچ وتابِ رازی

لیکن ایسا ہمیشہ نہیں رہا۔ زندگی کے متعلق اقبالؒ کا زاویہ نگاہ جیسے جیسے معین اور پختہ ہوتا گیا ویسے ویسے وہ عقل و استدلال کا نقاد بنتا گیا۔ اقبالؒ کی فکر کا ماخذ قرآن ہے۔ اس لئے پہلے اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ عقل و منطق کی قرآن میں کیا بنیاد ہے!

قرآن کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کا اسلوب منطقی استدلال سے کہیں بہتر ہے۔ کیونکہ یہ براہ راست جذبات انسانی کو اپیل کر کے مطلوبہ نتائج حاصل کر لیتا ہے۔ اس کے برعکس فلسفیانہ استدلال بے کیف اور خشک ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اس سوال کے جواب میں کہ ہڈیوں کو جب وہ بوسیدہ ہو جائیں گی کون ان کو دوبارہ زندہ کرے گا؟ قرآن نے کوئی منطقی استدلال پیش نہیں کیا بلکہ صرف یہ کہا کہ انہیں وہی خدا زندہ کرے گا جس نے انہیں پہلے پیدا کیا تھا۔

قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ○ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ "اس نے کہا کون ہڈیوں کو زندہ کرے گا جب وہ بوسیدہ ہو جائیں گی کہہ دیجئے ان کو وہی زندہ کرے گا جس نے پہلی بار پیدا کیا"۔

(سورہ یٰس۔ آیت 78-79)

خدا' کائنات اور اشیاء کے حوالے سے بھی متعدد مفکرین نے ٹھوکریں کھائیں۔ لیکن قرآن میں منطق واستدلال سے کہیں زیادہ بہتر اور موثر طریقے سے حقیقت سے پردہ اٹھایا گیا ہے:

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ○

"اللہ کی شان یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو جا تو پس وہ ہو جاتی ہے"۔

(سورۃ یٰس۔ آیت 82)

یہ سچ ہے کہ منطق اور سائنسی طرز فکر اور طرز بیان سے شان ربوبیت کی عکاسی نہیں ہوتی بلکہ براہ راست ایمان بالغیب سے دل و دماغ کی تشفی ہو جاتی ہے۔ جس کی تہہ میں جذبہ عشق حرارت بن کر دوڑتا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ انسان کو محدود عقل اور علم سے نوازا گیا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

وَ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَ مَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ○ "اور وہ تم سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ کہہ دیجئے روح میرے رب کا حکم ہے۔ اور تم کو اللہ کے علم سے کچھ نہیں ملا مگر تھوڑا"۔ (سورہ بنی اسرائیل۔ آیت 85)

اسی طرح ازل' ابد' لامحدود' لامکان ایسے تصورات جو اہمیت کے حامل ہیں عقل کی حدود سے خارج ہیں۔ ابلیس نے اسی محدود عقل سے آدم کو دیکھا تو اس کے اندر پھونکی ہوئی روح الوہیت اور ارتقائے انسانی کے لامحدود امکانات اس کی سمجھ میں نہ آسکے۔ عشق ابراہیم نے آتش نمرود میں بلا خوف و خطر چھلانگ لگا دی جبکہ عقل اب تک انگشت بدنداں ہے۔ مسیحؑ کو بنی اسرائیل نہ سمجھ سکے۔ وہ ان کے نزدیک منکر شریعت اور مخرب ملت ہونے کی وجہ سے سزائے موت کے مستوجب تھے۔ محمد ﷺ بھی ابو جہل اور ابو لہب کے لئے قابل فہم نہ ہوئے۔ ان لوگوں میں محدود دنیاوی عقل تو موجود تھی لیکن عشق الٰہی سے ان کا خیمہ خالی تھا۔

اقبالؒ کا میلان مذہبی اور روحانی ہے۔ اس لئے فلسفہ کا ذوق رکھنے کے باوجود وہ رفتہ رفتہ عقل طبیعی اور عقل استدلالی سے گریز کرتا ہوا عشق کے بحر بے کنار میں غوطہ زن ہو گیا جس کے مقابلے میں اسے عقل کی

جدوجہد سطحی اور ہیچ نظر آنے لگی۔

اقبالؒ کی بصیرت نے دیکھ لیا کہ حقیقت اولیٰ کی تلاش میں رومی کے جذبہ شوق کو منزل نصیب ہوئی جبکہ رازی کے فلسفیانہ نظریات اس کو عقل اور استدلال کے پر پیچ رستوں میں الجھا گئے۔

علاج آتشِ رومی کے سوز میں ہے ترا
تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں
ضمیرِ پاک و نگاہِ بلند و مستیٔ شوق
نہ مال و دولتِ قاروں نہ فکرِ افلاطوں

اگر منزل کی رسائی ہی مقصود ہے تو عقل و استدلال کی غلامی سے نجات ضروری ہے اور خلوص، صفائے باطن و دیدۂ بینا جیسی صفات کا حامل ہونا ضروری ہے۔

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

اسکی وجہ یہ ہے کہ عقل یا خرد ہمیں علم الیقین دیتی ہے اور عشق عین الیقین۔

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ
سکھائی عشق نے مجھ کو حدیث رندانہ

عقل/خرد ہمیں پر حکمت بصارت تو دیتی ہے لیکن نشہ حق سے سرشار بصیرت فراہم نہیں کرتی۔

عقل کے بارے میں اقبالؒ کا حقیقی عقیدہ یہ تھا کہ یہ ایک خداداد نعمت ہے اور انسانوں اور حیوانوں میں تمیز و فرق قائم کرتی ہے۔ لیکن درحقیقت اس کی کچھ حدود ہیں۔ ان حدود کے باہر اس کے دعوے لاحاصل اور لایعنی ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان حدود تک عقل سے زندگی کا احاطہ کرنا اور خارجی فطرت کی تسخیر انسان کے لئے لازمی ہے۔

فطرت کو خرد کے روبرو کر
تسخیرِ مقام رنگ و بو کر

عقل دانش ہے لیکن دانش اور بینش میں فرق ہے۔ عین الیقین علم الیقین سے بڑھ کر ہے۔ عقل منزل کی جانب ہماری رہنمائی تو کرتی ہے لیکن منزل کی رسائی اس کی پہنچ سے باہر ہے۔ ذرا اقبالؒ کے اشعار میں عقل کی حدود ملاحظہ کریں:

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں
دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں
علم میں بھی سرور ہے لیکن
یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں

عقل کا جو مقام سدرہ ہے وہاں سے عشق کا آغاز ہوتا ہے۔ اسی لئے اقبالؒ کی فکر عقل و دلائل کی الجھنوں سے عہدہ برآ ہونے کے بعد عشق سے ہم آغوش ہوگئی۔

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

اقبالؒ کے سفر کی کیفیت ملاحظہ کریں:

مقامِ عقل سے آساں گزر گیا اقبال
مقامِ شوق میں کھویا گیا وہ فرزانہ

فلسفے کا ایک ابدی استفہام یہ ہے کہ اس کائنات کا جوہر ازلی کیا ہے؟ اور اس میں جو آئین و قوانین دکھائی دیتے ہیں ان کا ماخذ کیا ہے؟ یونانیوں نے جب اس پر غور کیا تو کسی نے کہا کہ اصل پانی ہے۔ کسی نے کہا مادہ ہے۔ کسی نے ہوا کہا اور کسی نے آگ، کسی مفکر نے کہا کہ مظاہر فطرت محبت اور نفرت کی باہمی آویزش سے پیدا ہوتے ہیں۔ سقراط، افلاطون اور ارسطو کے ہاں حقیقی وجود صرف عقل کا ہے۔ اس طرح یونانی فکر سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ عقل ہی ماخذ وجود ہے اور عقل ہی معیار صداقت۔ اقبالؒ نے بھی اسی عالم عقل کی بہت سیر کی۔ وہ مغرب میں فلاسفہ مغرب کی محبت میں اسرار حیات کو دلائل سے فاش کرنے میں سعی بلیغ

کرتے رہے لیکن آخرش اسی نتیجے پر پہنچے کہ استدلال کی تقدیر میں حضور نہیں۔ استدلالیوں کا پائے چوبیں ان کو لڑکھڑاتے اور لنگڑاتے ہوئے چند قدم تک لے جاتا ہے لیکن کسی منزل تک نہیں پہنچاتا' اقبالؒ بھی اظہار تاسف کرتے ہیں:

مجھے وہ درس فرنگ آج یاد آتے ہیں
کہاں حضور کی لذت کہاں حجابِ دلیل

خرد زمان و مکان میں محدود ہو کر لازمانی اور لامکانی حقیقت کو تلاش کرتی ہے اور اس میں کامیاب نہیں ہوتی۔ اقبالؒ اس فکر کی خامی کو ذکر سے دور کرتا ہے:

نگہ الجھی ہوئی ہے رنگ وبو میں
خرد کھوئی گئی ہے چار سو میں
نہ چھوڑ اے دل فغانِ صبح گاہی
اماں شاید ملے اللہ ھو میں

عقل انسان کو تشکیک اور تذبذب کی بھول بھلیوں سے نہیں نکال سکتی۔ عقل کے نظریات ہر دم متغیر اور متصادم ہوتے ہیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں لیلیٰ نے بھی اسی حقیقت کا اعتراف کیا ہے:

میں کیسے سمجھتا کہ تو ہے یا کہ نہیں ہے
ہر دم متغیر تھے خرد کے نظریات

اس لئے اقبالؒ نے عقل کو عیار بھی کہا ہے۔

عقل عیار ہے سو بھیس بدل لیتی ہے
عشق بے چارہ نہ زاہد ہے نہ ملا نہ حکیم

اقبالؒ کا خودی کے ساتھ عقل اور عشق کا تعلق دیکھئے۔

خودی ہو علم سے محکم تو غیرتِ جبریل
اگر ہو عشق سے محکم تو صورِ اسرافیل

جبریل کا کام پیغام پہنچانا ہے لیکن اسرافیل کا کام قیامت انگیزی ہے۔ اور یہ جذبہ عشق سے بپا ہوتی ہے۔ عشق ہی خلاق اور فعال ہے۔ محض عقل کی کیفیت انفعالی ہے۔ انسانی ارتقاء میں جو قدم بھی اٹھتا ہے جذبہ عشق کی بدولت اٹھتا ہے۔ عالم علم میں مست رہتا ہے اور زاہد زہد میں۔ لیکن عاشق عشق میں لحہ بہ لحہ نئے احوال پیدا کرتا ہے۔ قیامت کے معنی ہیں پہلے عالم کی موت اور دوسرے عالم کا ظہور۔ قیامت کبریٰ کی حقیقت خدا کے سوا کسی کو معلوم نہیں لیکن دنیا میں جو کبھی قیامت صغریٰ سی بپا ہو جاتی ہے اور کسی مرد مجاہد کی بدولت کوئی انقلاب ظہور میں آتا ہے تو اس کا سرچشمہ عقل نہیں بلکہ عشق محشر انگیز ہوتا ہے۔ "برنارڈشا" نے اپنے مخصوص انداز میں کیا خوب کہا کہ انسانی زندگی میں بڑے بڑے انقلابات اور ترقیاں "نامعقولوں" کی بدولت ظہور میں آئی ہیں۔ انہوں نے جو کچھ کہنا یا کرنا چاہا ہر محتاط عاقل نے انہیں روکنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے کسی کی نہ سنی۔

اقبالؒ کے نظریات میں عشق و عقل کا موازنہ کئی جگہ پر ملتا ہے۔ اس کو وہ خبر اور نظر کا نام بھی دیتے ہیں۔ اس کی توضیح کو حسب ذیل طریقے سے بھی پیش کیا جاتا ہے:

اول : ایک وہ علم جو ہم دوسروں سے حاصل کرتے ہیں اس علم کا بڑا ذریعہ عموماً" کتابیں ہوتی ہیں۔ اس کو تقلیدی علم بھی کہتے ہیں۔

دوم : دوسرا علم وہ ہے جو براہ راست ہمارے دل پر منکشف ہوتا ہے اور نسبتاً" زیادہ موثر اور پریقین ہوتا ہے۔

پہلی قسم کو اقبالؒ نے خبر' عقل' علم اور دانش کا نام دیا ہے اور اسی قسم کی حدود کا تعین کر کے اس کی تردید کر دی ہے۔

دوسری قسم کو انہوں نے نظر' قلب اور بینش کا لقب دیا ہے۔ فلسفہ اور سائنس دانش ہے اور وجدان و عرفان بینش۔ اقبالؒ کے ان نظریات کی عکاسی یہ اشعار کرتے ہیں:

یا حیرتِ فارابی' یا تاب و تبِ رومی
یا فکر حکیمانہ' یا جذبِ کلیمانہ
یا عقل کی روباہی یا عشق یداللہی
یا حیلہ ٔ افرنگی یا حملہ ٔ ترکانہ

☆ ☆ ☆

خبر' عقل و خرد کی ناتوانی
نظر' دل کی حیاتِ جاودانی

بانگ درا کے پہلے دور کی ایک سیدھی سادی نظم "عقل و دل" اقبالؒ کے ان نظریات کو بخوبی بیان کرتی ہے۔ پروفیسر سید وقار عظیم نے اس نظم کو عقل و دل کی کہانی کا نام دیا ہے۔ اس میں دونوں کردار مجسمہ ہو کر ہمارے سامنے آتے ہیں:

عقل نے ایک دن یہ دل سے کہا
بھولے بھٹکے کی رہنما ہوں میں
ہوں زمیں پر' گزر فلک پہ مرا
دیکھ تو کس قدر رسا ہوں میں
کام دنیا میں رہبری ہے مرا
مثلِ خضرِ نجستہ پا ہوں میں
ہوں مفسر کتابِ ہستی کی
مظہرِ شانِ کبریا ہوں میں
بوند اک خون کی ہے تو' لیکن
غیرتِ لعلِ بے بہا ہوں میں

عقل بزعم خود یہ دعویٰ کرتی ہے کہ اس کی رسائی زمین و آسمان پر ہے اور منزل کی رہنمائی میں اس کا ساتھ بہت ضروری ہے۔ اس نظم میں اقبالؒ نے عقل کو ایک پر غرور اور احساس برتری کے نشے میں مدہوش دکھایا ہے۔ جبکہ اس کے مقابلے میں "دل" کے پروقار اور دلنشین مکالمے کا اظہار دیکھئے:

رازِ ہستی کو تو سمجھتی ہے
اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
ہے تجھے واسطہ مظاہر سے
اور باطن سے آشنا ہوں میں
علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے
تو خدا جُو' خدا نما ہوں میں
علم کی انتہا ہے بے تابی
اس مرض کی مگر دوا ہوں میں
شمع تو محفلِ صداقت کی
حسن کی بزم کا دیا ہوں میں
تو زمان و مکاں سے رشتہ بپا
طائرِ سدرہ آشنا ہوں میں
کس بلندی پہ ہے مقام مرا
عرشِ ربِّ جلیل کا ہوں میں

تاریخ اسلام میں اقبالؒ کا حقیقی پیش رو عارف رومی ہے۔ مولانا روم فلسفہ اور تصوف دونوں کے اسرار و رموز سے واقف تھے۔ اس لئے وہ ان دونوں کے فرق و امتیاز کو بھی جانتے تھے۔ رومی کے تصورات میں عشق و مستی کا غلبہ نظر آتا ہے۔ اقبالؒ بھی رومی کے زیر اثر عشق کے زبردست تصور کو پیش کرتا ہے۔ عشق کو اقبالؒ کے دل پر مکمل گرفت حاصل ہے۔ عشق نہ فقہ ہے' نہ حکمت نہ زہد۔ اس میں یک بینی' یک گیری اور سادگی ہے۔ عشق انسان کے اندر بصیرت اور قوت دونوں کا اضافہ کرتا ہے اور اس کو ایک ایسی حقیقت سے آشنا کرتا ہے جو زمانی و مکانی نہیں۔ عشق کی قوت طبیعیات کے علم سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ اس کا مآخذ روح انسانی ہے جس کی باطنی قوتیں لامتناہی ہیں۔ عشق حقیقی مآخذ حیات بھی ہے اور مقصود حیات بھی۔ وہ جادہ حیات بھی ہے اور منزل حیات بھی۔

ہے ازل کے نسخہ ٔ دیرینہ کی تمہید عشق
عقلِ انسانی ہے فانی' زندہ وجاوید عشق

عشق حسن سے پیدا ہوتا ہے اور خود حسن آفرینی کرتا

ہے۔ حسن و عشق ایک دوسرے کے لئے علت و معلول ہیں۔ اقبالؒ کے کلام میں عشق اور خودی کا مضمون جا بجا ایک ہو گیا ہے۔ عشق کو خودی سے اور خودی کو عشق سے تقویت حاصل ہوتی ہے۔ اصل عشق وہی ہے جو اپنے اندر سے ابھرے۔ دوسروں کی آگ پر گرنا یا دوسروں سے تجلی کا تقاضا کرنا خودی اور عشق دونوں کو نقصان دیتا ہے۔ اقبالؒ کے مطابق علم نے جو سوالات پیدا کئے ان کے جواب عشق کی بدولت حاصل ہوئے۔ ضرب کلیم میں "علم و عشق" کے عنوان سے جو نظم ہے وہ اس موضوع پر اقبالؒ کی لاجواب نظموں میں سے ایک ہے۔ ذرا اس کے چند مصرعے ملاحظہ کریں :

عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب
علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پنہاں جواب

عشق سراپا یقیں اور یقیں فتح یاب
علم ہے ابن الکتاب، عشق ہے امّ الکتاب

یوں تو اس موضوع پر ابھی سیر حاصل بحث ہو سکتی ہے لیکن طوالت کے پیش نظر میں اس کو یہیں ختم کرتی ہوں۔ اب تک کے فکر اقبالؒ کے مطالعے سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اقبالؒ کی فکر کی اساس قرآن ہے۔ اقبالؒ نے اسلام اور قرآن کے اصل منشاء کو سمجھتے ہوئے عقلی اور منطقی موشگافیوں کی تردید کی اور عشق کی بصیرت سے خالق کائنات کو سمجھنے کی ایک نہایت کامیاب کوشش کی۔ اللہ تمام مفکرین اور خصوصاً مفکرین اسلام کو فکر کی گمراہی اور ضلالت سے محفوظ رکھے۔ آمین

عید مبارک

جشن نزول قرآن مجید

پر

دلی ہدیہ تبریک قبول فرمایئے

اے نوع انسانی !

تمہارے پاس تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے ایک ضابطہ حیات آگیا ہے جو ہر اس کشمکش کا علاج ہے جو تمہارے سینوں کو وقف اضطراب رکھتی ہے۔ جو قوم اس کی صداقتوں پر یقین رکھتی ہے یہ اس کی راہنمائی، زندگی کی منزل مقصود کی طرف کرتا ہے اور اسے سامان نشوونما سے بہرہ یاب کر دیتا ہے۔

کہو کہ یہ خدا کے فضل و رحمت سے عطا ہوا ہے۔ لہٰذا تمہیں چاہئے کہ ایسے ضابطہ حیات کے ملنے پر جشن مسرت مناؤ۔ یہ اس تمام سازوسامان سے بہتر ہے جسے تم جمع کرتے ہو۔

(القرآن کریم : یونس 10، آیت 58)

رباعیات

پروفیسر نجمی صدیقی

فرقان کی تعلیم کو تعلیم سمجھ
رحمٰن کی تعلیم کو تعلیم سمجھ
دنیا کو بدلنا ہے اگر جنت میں
قرآن کی تعلیم کو تعلیم سمجھ

افکار ہیں ہر علم پہ غالب اسکے
مبنی ہیں صداقت پہ مطالب اسکے
قرآن ہے مضبوط حوالہ دیں کا
ہر دور کے انسان مخاطب اسکے

اقوام کو قرآن نے عزت بخشی
اسلام کو اپنایا تو راحت بخشی
اوہام کی دلدل سے نکالا اس نے
کفار پہ غلبہ دیا عظمت بخشی

پڑھتے ہو پڑھاتے ہو، عمل بھی تو کرو
مُردوں کو سناتے ہو، عمل بھی تو کرو
تم ناظرہ پڑھتے ہو شب و روز مگر
خود ڈوبتے جاتے ہو، عمل بھی تو کرو

اعمال پہ دنیا کے نظر رکھتا ہے
ہر چیز کی ہر وقت خبر رکھتا ہے
لفظوں سے بہلتی نہیں قدرت اس کی
کردار کوئی ہو تو اثر رکھتا ہے

ایمان کو قرآن کے تابع رکھو
اعمال کو رحمٰن کے تابع رکھو
طاغوت کی ذلت سے بچاؤ خود کو
اللہ کے فرمان کے تابع رکھو

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حقائق و عبر

1- لفظ "مولانا" کا اطلاق

روزنامہ جنگ کی 7 نومبر کی اشاعت میں ادارتی صفحے پر ارشاد احمد حقانی صاحب کے کالم "حرفِ تمنا" میں ان کی ڈاکٹر عبدالودود صاحب کے ساتھ مراسلت شائع ہوئی جس میں منجملہ اور باتوں کے لفظ "مولانا" کے غیر اللہ پر اطلاق کو ناجائز قرار دیا گیا۔ ماہنامہ نور الحبیب (بصیر پور) میں پروفیسر منیب الرحمٰن صاحب کا ایک مضمون بعنوان "لفظ مولانا کا اطلاق" شائع ہوا ہے۔ جس میں انہوں نے غیر اللہ کیلئے "مولانا" کا استعمال جائز قرار دیا ہے۔ لغوی تحلیل و تجزیہ کے بعد پروفیسر صاحب اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ "مولانا" جب کسی عالمِ دین کیلئے بولا جائے تو اس کے معنی ہوں گے ہمارے سردار، ہمارے آقا وغیرہ۔ آخر میں کہتے ہیں کہ ایک عالمِ دین کو اخلاص و للہیت، عجز و نیاز اور انکسار کا پیکر ہونا چاہئے اور اس بات کی خواہش و آرزو نہیں کرنی چاہئے کہ لوگ انہیں مولانا کہہ کر پکاریں کیونکہ اس سے اپنی تقدیس کا زعم پیدا ہوتا ہے۔ اس بات سے ہمیں سو فیصد اتفاق ہے۔ ہم نے اکثر علمائے کرام کو خود اپنے آپ کو مولانا کہتے ہوئے سنا ہے۔ حتیٰ کہ ان کے وزیٹنگ کارڈز اور لیٹر پیڈز دیکھئے تو آپ کو ان کے نام کے ساتھ "مولانا" جلی حروف میں لکھا نظر آئے گا۔ وہ کوئی خط، درخواست یا مضمون تحریر فرمائیں گے تو نیچے اپنے نام کے ساتھ "مولانا" کا اضافہ ضرور فرمائیں گے۔ گویا وہ اپنی عزت افزائی کرتے ہوئے خود کو ہی "ہمارے آقا" "ہمارے سردار" کہہ رہے ہوتے ہیں۔

بایں علم و دانش بباید گریست

2- مقلدین بھی منکر حدیث ہیں

ہفت روزہ جریدہ "ترجمان" دہلی میں کئی مہینوں سے مقلدین و غیر مقلدین میں ایک بحث چھڑی ہوئی ہے جس میں فریقین کا اپنے اپنے مسالک و مذاہب کو صحیح ثابت کرنے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور صرف ہو رہا ہے۔ اس بحث میں اور مسائل کے علاوہ نماز کے مسائل سب سے زیادہ مابہ النزاع بنے ہوئے ہیں۔ نیت باندھنے سے لیکر سلام پھیرنے تک ان میں اختلافات ابھر کر سامنے آرہے ہیں۔

ہم اس بحث میں سے جو اقتباس آپ کے سامنے پیش کرنے جا رہے ہیں وہ حدیث سے متعلق ہے جس میں مقلدین (حنفی، مالکی، حنبلی، شافعی) کو منکرِ حدیث قرار دیا گیا ہے۔

دیکھو ہمیں جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

"غازی پوری صاحب اپنی ڈائری میں مولانا محمد صاحب جونا گڈھیؒ کی کتاب "طریقِ محمدی" کے حوالہ سے ایک اقتباس نقل کرتے ہیں:

"قرآنِ پاک خداوند تعالیٰ کی وحی، قرآن و حدیث کو ماننے اور اس کے سوا کسی اور کے نہ ماننے کی کھلے الفاظ میں منادی کرتا ہے۔ فرماتا ہے اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ط(اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ چیز قرآن و حدیث کی تابعداری کرو۔)" (7/3)

اس اقتباس کے بعد غازی پوری صاحب کا تبصرہ پڑھئے اور دیکھئے کہ اس صحیح وضاحت پر وہ مولانا جونا گڈھی پر کس طرح برہم نظر آتے ہیں۔ تحریف کا الزام لگاتے ہوئے ان کی آنکھیں خشمگیں ہیں، چہرہ تمتمایا ہوا ہے، بھویں تنی ہیں اور منہ سے جھاگ نکل رہا ہے۔

"میں کہتا ہوں کہ **ما انزل الیکم من ربکم** کی تفسیر یا ترجمہ میں قرآن و حدیث کہنا یہ مولانا جونا گڈھیؒ کی انتہائی جرأت ہے۔ حدیث کا مقام چاہے جتنا بلند کرو مگر خدا کے

کلام میں تحریف تو نہ کرو۔ جو بات جہاں تک ہو اس سے آگے بڑھنا اور وہ بھی مرادِ خداوندی بتلاتے وقت یہ صریح گمراہی اور ضلالت ہے۔ یہ بخاری و مسلم یا حدیث کی دوسری کتابوں میں جو کچھ ہے وہ آسمان سے اترا ہوا کلام خداوندی ہے؟ کیا حدیث **ما انزل الیکم من ربکم**" میں داخل ہے؟ یہ قرآن کی تحریفِ معنوی نہیں ہے؟

(ص 32-31)

قارئین کرام! غازی پوری صاحب نے یہاں صاف صاف اپنا مذہب بتلا دیا۔ اور ان کے اس تبصرے سے چھ باتیں معلوم ہوئیں:

1- اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ چیزوں میں حدیث داخل نہیں ہے۔

2- مولانا محمد جونا گڈھیؒ نے **ما انزل الیکم من ربکم** میں حدیث کو داخل کر کے بڑی گستاخی اور انتہائی جرأت کا کام کیا ہے۔

3- ایسا کرنا خدا کے کلام میں تحریف ہے۔ گمراہی اور ضلالت ہے۔

4- بخاری و مسلم اور حدیث کی دوسری کتابوں میں جو کچھ ہے اس کا تعلق وحیِ الٰہی سے بالکل نہیں ہے۔

5- حدیثِ رسولؐ **ما انزل الیکم من ربکم** یعنی وحی الٰہی میں داخل نہیں ہے۔

6- اور جو ایسا لکھتا ہے اس کا عقیدہ غلط ہے کیونکہ یہ تحریف قرآن کے مترادف ہے۔

اسی کتاب کے ص 24 پر آپ لکھتے ہیں:

"حدیث کو وحی الٰہی کا درجہ دینے اور قرآن کا ہم مرتبہ بنانے کی کوشش دین و ایمان کی کون سی قسم ہے؟"

ناظرین سے گذارش ہے کہ آگے بڑھنے سے پہلے مقلدین کے مذہب کا خلاصہ ذہن میں محفوظ کر لیں تاکہ آئندہ صفحات میں قرآن کے دلائل سے ان کے بارے میں بصیرت حاصل ہو سکے۔

مقلدین کے دین و مذہب کا خلاصہ یہ ہے کہ وحی الٰہی سے حدیث کا کوئی تعلق نہیں ہے، قرآن و حدیث ہم مرتبہ نہیں ہیں ان میں بہت زیادہ فرق ہے۔ قرآن اللہ کا کلام ہے اور حدیث رسول اللہ ﷺ کا ذاتی کلام ہے جس میں رسول کی مرضی و منشاء کا دخل ہے اور جب ایسا ہے تو ظاہر ہے کہ قرآن پر ایمان لانا اور حکم الٰہی کی اطاعت کرنا ضروری ہے لیکن رسول کی حدیث پر عمل کرنا اور ان کا حکم ماننا ضروری نہیں ہے۔"

اور نتیجہ یہ نکالتے ہیں۔

"اس طرح منکرینِ حدیث اور مقلدین میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا سوائے اس کے کہ وہ لوگ صرف قرآن کریم کو اپنے لئے کافی سمجھتے ہیں اور یہ لوگ تقلیدِ جامد کی پناہ میں آکر حدیث رسول ﷺ کو قابلِ التفات اور لائقِ عمل نہیں سمجھتے۔" (ترجمان دہلی 16 تا 23 اکتوبر 1998ء- صفحہ 15-14)

طلوع اسلام: بجز فرقہ اہلِ قرآن، منکرینِ حدیث کا کم از کم پاکستان میں کوئی وجود نہیں۔

3- احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر...

روزنامہ جنگ کی 8 دسمبر 98ء کی اشاعت میں ایک خبر شائع ہوئی ہے جس کا متن بلا تبصرہ درج ذیل ہے۔

"صاحب زادہ حامد سعید کاظمی نے علامہ احسان اللہ کی پہلی برسی پر خطاب کے دوران کہا کہ دوسری اشیاء کی طرح دو نمبر علماء کی بھی بہتات ہے۔ یہ علماء جس قسم کے فتوے دیتے ہیں اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگائیے کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ رشتہ داروں کے دباؤ پر وہ ایک دو نمبر عالمِ دین کے پاس طلاق واپس لینے کا فتویٰ لینے گیا۔ عالمِ دین نے پوچھا کہ تم نے "ط" سے طلاق دی یا "ت" سے، آدمی نے کہا کہ "ت" سے۔ عالمِ دین نے قاریوں کی طرح لفظ طلاق ادا کر کے "ق" کا حرف حلق سے نکالتے ہوئے پوچھا کہ تم نے طلاق کا لفظ عربی مخرج کے مطابق حلق سے نکالا تھا یا عام طریقے سے "ک" بولا تھا۔ آدمی نے کہا کہ میں نے عام طریقہ سے ہی لفظ بولا تھا۔ مولانا نے کہا کہ تم طلاق واپس لے سکتے ہو کیونکہ جب تمہیں "ط" اور "ت" اور "ق" اور "ک" کے الفاظ کا فرق اور ان کا مخرج ہی معلوم نہیں اور طلاق کا لفظ تم نے عربی لہجے میں ادا ہی نہیں کیا تو یہ طلاق نہیں ہوئی۔"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقد و نظر

نام کتاب : دِل دِل پاکستان مؤلف : کرنل ڈاکٹر عبدالقدیر
صفحات : 330 قیمت : =/200 روپے
ناشر : میسرز اکمل قدیر اینڈ کمپنی E/42 سٹریٹ' 8 کیولری گراؤنڈ' والٹن روڈ' لاہور چھاؤنی

کرنل عبدالقدیر پیشہ کے اعتبار سے ڈاکٹر ہیں اور ایک طویل عرصہ تک مسلح افواج میں نمایاں خدمات دینے کے بعد ریٹائر ہوئے۔ زمانہ طالب علمی (1940-1947ء) کے دوران اخبارات اور رسائل میں تحریک پاکستان سے متعلق شائع ہونے والے مضامین اور بیانات کو اپنی ڈائری میں لکھ لیا کرتے تھے اور کالج سے فارغ ہو کر اپنے دوستوں کے ساتھ اس کتاب کو بغل میں دبا گاؤں گاؤں' گھر گھر تبلیغ کے لئے نکل پڑتے اور کتاب میں لکھے حوالہ جات کی مدد سے مخالفین کے اعتراضات کے جواب دیتے اور مسلمانوں کو پاکستان کی ضرورت اور اہمیت سے روشناس کراتے۔ ان مضامین سے پتہ چلتا ہے کہ پاکستان بننے سے پہلے ہندوؤں' مخالف مسلمانوں اور علماء کرام کی پاکستان کے متعلق کیا سوچ تھی اور کس طرح یہ لوگ مسلمانوں کو بدظن کر رہے تھے۔ آج کے نوجوانوں کو یہ بھی معلوم ہو جائیگا کہ پاکستان کیوں بنایا گیا اور کن حالات میں بنایا گیا اور ان کے بزرگ اس جدوجہد میں انگریزوں اور ہندوؤں کے پیدا کردہ مصائب و مشکلات کس خندہ پیشانی سے برداشت کرتے رہے۔ ڈاکٹر صاحب کے جمع کئے ہوئے مضامین اب ایک قیمتی دستاویز کی صورت اختیار کر چکے ہیں اور ان میں سے بیشتر نایاب ہیں۔ ان کی افادیت کے پیش نظر روزنامہ مشرق نے ان مضامین کی تقریباً" بیس (20) قسطیں 1992ء میں شائع کیں۔

کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

حصہ اول میں۔۔ ہندو اور مخالف مسلمان لیڈروں کے بیانات۔ جنگ آزادی کے گمنام مجاہد۔ پنجاب میں فسادات۔ دو قومی نظریہ۔ اسلام اور پاکستان کے خلاف گہری سازش شامل ہیں۔

حصہ دوئم میں۔۔ جدوجہد آزادی میں علماء کا کردار۔ اسلامی آئین کی پیچیدگیاں۔ اسلامی آئین کیسے بن سکتا ہے۔ اسلامی مملکت کے خدوخال۔ الیکشن اور علماء کے فتوے۔ کیا علماء ایک آئین پر متفق ہو سکتے ہیں جیسے عنوان شامل ہیں۔

حصہ سوئم میں۔۔ ہماری تاریخ کا سفر۔ اسلام کی ہند میں آمد۔ تقسیم ہند میں گھپلا۔

انگریزی سیکشن میں۔۔ کشمیر اور شاہی خاندان کی سازش۔ ہندوستانی مسلمانوں کی حالت۔ ہندوستان کے خفیہ ادارے RAW کی سرگرمیاں اور ڈاکٹر صاحب کے چند مضامین جو اخبارات میں (1983-1987ء) میں شائع ہوئے۔ یہ ایک دلچسپ اور معلوماتی کتاب ہے جس کا مطالعہ علم میں اضافہ اور پاکستان کا پس منظر نمایاں کرتا ہے۔

خوبصورت سرورق۔ عمدہ طباعت۔ حوالہ جات سے مزین یہ کتاب دفتر طلوع اسلام سے بھی دستیاب ہو گی۔

research organization in evolving banking practices compatible with Islamic ideals of social and economic life. The economic system of the West has created almost insoluble problems for humanity... The adoption of western economic theory and practice will not help us in achieving our goal of creating a happy and contented people. We must work our destiny in our own way and present to the world an economic system based on true Islamic concept of equality of mankind and social justice."

Such an accomplishment, he said, would "be fulfilling our mission as Muslims...." And this he said after his August 11, 1947, speech.

This essay must end with Yahya Bakhtiar's word of reproach to the current crop of the secularists. He was obviously referring to Wali Khan's antics with the Quaid's speech in his "concluding address in Supreme Court," p.104:

"Not only Mr. Wali Khan but some so-called progressive intellectuals have from time to time tried to misinterpret these passages and sedulously created the impression that [the] Quaid-e-Azam believed in secularism and that he had given up the two-nation theory as soon as Pakistan was won on the basis of the two-nation theory."

Needless to say, Bakhtiar cannot be accused of being an "Islamist," though he is certainly a man of intellectual probity who would not doctor the meaning of the text that was apparent.

(Courtesy Daily DAWN)

Saturday, October 3, 1998

For All Publications of Allama Parwez
and recorded lectures on Quran
Please contact:
TOLU-E-ISLAM TRUST
25-B,Gulberg 2 Lahore-Pakistan.
Current Account No·
4107-35
Main Gulberg Branch
Habib Bank Limited
Lahore
Phone: 5753666 - 5764484
Fax: 092-42-5764484
Email: trust@toluislam.com
Internet: http://www.toluislam.com

Constituent Assembly, that the minorities in Pakistan would be treated as our citizens and will enjoy all the rights and privileges that any other community gets..."

From the early days, however, he knew that India was engineering communal strife to undo Pakistan. To a question if he considered "that Pakistan and India have now passed through the worst of the communal trouble," he answered with conviction: "It is now clear beyond doubt that it was well-planned, well-organized, and well-directed and the object of it all, it seems to me, was to paralyse the new-born Dominion of Pakistan, which obviously was starting from scratch."

At the same time, he urged Muslims to safeguard the lives of the minorities. "It is the duty of every Muslim as a man of honour -- and, what is more, his religion enjoins it upon them that there should be no retaliation or revenge... that we mean to give [minorities] a fair deal as our citizens."

Time and again, he cited tolerance and patience and the rights of the minorities in the Islamic context. In his famous speech of October 20, 1947, in Lahore, he said, "We have been the victims of a deeply-laid and well-planned conspiracy executed with utter disregard of the elementary principles of honesty, chivalry and honour." He asked them to "take... inspiration and guidance from the Holy Qur'an [and] the final victory, I once again say, will be ours." In summation, he reminded them: "Islam enjoins on every *Muslman* to give protection to his neighbours and to minorities regardless of caste and creed."

The secularists may not like to hear it but when Wali Khan read secularism in Jinnah's speech, he was corrected by Bhutto's attorney-general Yahya Bakhtiar before the Supreme Court: "Religion, as it is normally understood by non-Muslims, means practice of sacred rights and observance of certain rituals. The Quaid-e-Azam did not use the word 'religion' in the sense of '*Deen*' or [a] code of life. When he said that religion had nothing to do with the business of the state, the context obviously allowed this in the former sense only."

Sometimes when I hear the clatter for secularism, I wonder what would have the Quaid said on the secularists' attempt to waylay Pakistan of its Islamic destiny. I am sure he would have said the same words with the same emphasis reminiscent of his Karachi bar Association speech of January 25, 1948. He said, he could not "understand a section of the people who deliberately wanted to create mischief and made propaganda that the constitution of Pakistan would not be made on the basis of [the] *Shari'at*." The Quaid said, "Islamic principles today are as applicable to life as they were 1,300 years ago."

Again, it was to stanch the notion of a secular Pakistan that he chose the inaugural occasion of the State bank. Describing the occasion as symbolic of "the sovereignty of our state," he said: "I shall watch with keenness the work of your

assumption, let me tell you that I shall not depart from what I said repeatedly with regard to the minorities. Every time I spoke about the minorities I meant what I said and what I said I meant... They will have their rights and privileges and no doubt along with it goes the obligation of citizenship..."

This was the time when the minority problem was brewing fast. The refugees form Central India and East Punjab had begun trekking their way to Pakistan. Muslims had not seen a calamity of this dimension before. There was hardly a family spared of loss. People mourned their dead, many ill-clad and without household effects. Added to their personal tragedy were the scant resources of the new state. The environment was charged with the cries of revenge. A terrible blow as it was to "his" Pakistan, he wanted to defuse it by making a two-plank move -- assuring minorities of their equal status on the one hand and asking Muslims to be magnanimous, on the other. "You may belong to any religion or caste or creed -- that has nothing to do with the business of the state," he declared. His hope was that with the passage of time "Hindus would cease to be Hindus and Muslims would cease to be Muslims, not in the religious sense, because that is the personal faith of each individual, but in the political sense as citizens of the state."

What does this really mean? First, when it comes to administration of justice, rights and services, religion is not the criterion. Everybody will get these irrespective of his faith as a citizen. Second, since the new state has come into being as a consequence of the Muslim stivings, they must not think they were more equal than the others. Such thinking on their part will be wrong because in the political sense as citizens, their religious identity would not matter; the state will dispense its services to all alike.

Needless to say this was an Islamic approach and replicated in a way what *"Mithaq-i-Madinah"* accomplished in the Prophet's time. The conclusion derives its support from his August 14 inaugural address to the same Constituent Assembly when Jinnah himself contextualized his August 11 speech by linking minorities' just treatment to the Prophet's *Sunnah*:

"It dates back thirteen centuries ago when our Prophet not only by words but by deeds treated the Jews and Christians, after he had conquered them, with the utmost tolerance and regard and respect for their faith and belief. The whole history of Muslims, wherever they ruled, is replete with those human and great principles which should be followed and practiced."

Mr. Jinnah elaborated further on subsequent occasions. While responding to a question from the Reuter's correspondent on possible peace between Pakistan and India, he said: "I have repeatedly made it clear, especially in my opening speech to the

economic, social and political life in a way we think best, and in accordance with our own ideals..."

The secularist's contention that Islamic Pakistan is a kind of an interpolation carried out in the post-independence era is at best rewriting history in the face of facts. Dr Waheed Qureshi has counted 90 speeches made by the Quaid between 1940 and 1947 in which he assured his people that the emerging Pakistan will be an Islamic one.

So what happened on August 11? Did he perform a somersault --- an about-face? To say so would amount to Jinnah's character assassination. To think that he was consistently a secularist or a liberal in the western tradition, as has been alleged, would be equally unfair, an attribution wholly false. And even if he was a liberal, it was not in a philosophical sense but within the Islamic tradition -- a matter of approach and not of substance.

After all, he was not a *Mulla* but an enlightened Muslim, who was aware of his Islamic heritage, and who wanted to create a new world of Islam by carrying its tradition to the present.

Then what was it that he wanted to convey to the Muslims and non-Muslims alike in his August 11, 1947, speech? For an honest evaluation of his speech, three things are important:

- Did he say something similar to it in the pre-1947 era that could contextualize it?
- Were there any antecedents to his August 11 speech that made him say so?
- Did he repeat himself in the same expression which could be construed as secular?

The first significant statement from Jinnah on minority protection came in 1941 when he said; "Islam stands for justice, equality, fair play, toleration and even generosity to non-Muslims who may be under our protection." The second in 1942 when he said their "rights would be fully safeguarded according to the injunction from the highest authority, namely, [the] Qur'an, that a minority must be treated justly and freeplay." In1943 he repeated himself while talking to a Hindu delegation: "We will treat our minorities not only in a manner that a civilized government should treat them but better because it is an injunction in the Qur'an to treat the minorities so."

Obviously, in promising to give protection to minorities his context was Islam. In his July 14, 1947 press conference, while still in New Delhi, he was asked for a brief statement on the minorities' problem. His reply was candid as well as consistent. "At present I am only governor-general designate," said he. "We will assume for a moment that on August 15, I shall be really the governor-general of Pakistan. On that

disfavoured), or the question of a few more Muslim seats in the legislature? Worried as he was, he viewed the Muslim's cultural existence under stress and sought to safeguard it, for in it he thought was the Muslim integrity and their strength. His March 1936 speech in the Legislative Assembly talked of it:

"You may be the largest number, you may be more advanced; and you may be stronger economically... But let me tell you (he was addressing the Hindus)... you will never be able to destroy that culture which we have inherited, the Islamic culture, and that spirit will live, is going to live and has lived. - You may overpower us, you may oppress us; and you can do your worst. But we have come to the conclusion and we have made a grim resolve that we shall go down, if we have to go down, fighting."

Contrary to the secularists' notion of religion as a private affair, he believed in Islam as a civilizational force that can assert itself even in the polyglot social environment of British India, where Muslims had been marginalized in the post-1857 colonial set-up. This was known to Iqbal who could eulogize Jinnah for his Islamic essence as someone who is "the only Muslim in India today to whom the community has the right to look up for safe guidance" and share with him his belief that "the enforcement and development of the Tiara's of Islam is impossible in this country without a free Muslim state or states."

To think that Jinnah was consistently a secularist or a liberal in the western tradition, as has been alleged would be unfair, an attribution wholly false. And even if he was a liberal, it was not in a philosophical sense but within the Islamic tradition -- a matter of approach and not of substance.

This discernment of his Islamic character is vital to one's understanding of him, for it proves that he did not live on a make-believe image but on substance known to those who knew him. The first witnessing came from Jinnah's sister. The second from a man whom Jinnah considered his mentor and friend (Iqbal). And the third came from the people who believed in his dream and joined him to make it happen. Jinnah could have shielded his thoughts from others but not from those who shared his life. That is why internal witnessing is far more important in measuring a man's character than the exterior he projected to outsiders.

Unlike the secularists, he did not believe in the contentless democracy. Nor did he think the democratic dispensation was an end in itself. In that sense, he was an anti-democrat, for otherwise he would not have remapped British India. He knew the implications of the numbers game, which weighed heavily against the Muslims and would have resulted in "the complete destruction of what is most precious in Islam." For him, Pakistan was a must "to develop to the fullest our spiritual, cultural,

- A secularist disowns the divine act of creation. For him or her universe has come on its own and is forever. Nor is there anything like revelation (*Wahi*) or prophethood
- Even when a secularist allows for God's existence, he may claim himself to be an agnostic, though the God so visualized is still indifferent to humans and creation
- Religion has no business with the state. Nor can religion be allowed to determine one's identity, politics, and lawmaking.

Not a single part of the preceding criterion revealed itself in Jinnah's life of seventy-two.

During this long period, he fathered a state in the full glare of history. Millions heard him as well as read him. To set the record straight, Islam did not come to him late in his life: his sense of Muslimness surfaced when he was hardly sixteen. Fatima, his sister, was privy to his religious essence. He opted for Lincoln's Inn because, as he told her, he saw the Prophet's name engraved on its entrance as among the greatest lawgivers. This visual experience that he underwent must have given him the intellectual grasp of Islam as the *shari'ah* (law)-- relevant to life beyond rituals and dogmas.

As early as 1911, he got himself identified as one who could articulate not only his people's feelings about Islam but also knew law's cognate relation with nation building. Addressing the Imperial Privy Council, he criticized the British attempt to change the *Waqf* laws: "If I may put it in this way, you have cut off an important limb of the body of jurisprudence of Islamic law," said he. The *waqf*, as he perceived it, was an extended concept "interwoven with the religious life, the social life and the basic principles of economy of the community, and the result would be -- and is -- disruption of *Muhammadan* families."

His contempt for secularism was evident from his stand on the Special Marriage Amendment Bill (1912) because it sought to amend the Islamic law to "suit the times." In other words, he did not consider Qur'anic injunctions as "medieval" or "retrogressive" -- terms often used by the secularists. Rather, he believed in their transcendence and immutability. The said bill allowed for inheritance to an apostate in a Muslim family which, he said, was being proposed despite "an injunction in the Koran about the forfeiture of inheritance by a *Muhammadan* in case of apostasy...."

In 1930s when he had exiled himself to England, his reason for his return to politics was equally Islamic. He thought, "the *Musalmans* were in the greatest danger." What was this " greatest danger" that he was referring to? Were these economic issues (which he characterized as socialistic and communistic ideas and

two are different in substance as well as texture. Nor does Jinnah, while distinguishing Islam from theocracy, was making a plea for a state spliced from Islam.

So, what is Cowasjee's problem? Probably his minority consciousness does not let him sympathize with the Islamic moorings of the Pakistan movement. Second, he is selective with facts. That is why, instead of evaluating Jinnah's August 11, 1947, speech in the context of his other speeches on the same subject, he tries to read a secular Jinnah in that particular speech.

Unfair as it is, there is another edge to the problem. If Cowasjee's view is to be accepted, then one is faced with the problem of reconciling Jinnah's innumerable statements on Islamic governance for the new state with secular governance as implied by Cowasjee. In that case, it can be resolved in the following four ways:

- ➔ Jinnah of Pakistan did not make any pledge to Islamic governance.
- ➔ Jinnah used double speak and thus deceived his people (this would be the unkindest cut to him).
- ➔ Jinnah suffered from dementia, forgetting everything he had said prior to 1947.
- ➔ Jinnah was a secularist.

In either case, Jinnah's image will be badly hurt and history bled.

Judging a man's character calls for some objectivity in which the person put on the spot has to be measured against the evidence stretched over a life span. The evidence produced has to be configured into a pattern in which isolated utterances made by a person have to be sifted and their meaning sought either in his general outlook or related to subsequent utterances on the same subject. Besides, if there are two seemingly contradictory strains in a person's thoughts, then it should be reconciled to dissolve the paradox. If it does not, then the trends should be separated and identified as minor and major trends. In such a situation, the major trends must be allowed to prevail and accepted.

Most important, it should be seen if the strain being identified is consistent or not. In the latter case, its meaning has to be figured out in the context of his other statements. Short of applying this criterion, the exercise will be nonacademic, worthy of contempt.

Likewise, one must know what characterizes a man secularist. Without settling this issue, the debate will degenerate itself into a fandango. I think it embraces the following:

- ➔ A genuine secularist does not believe in a transcendent God as creator, nourisher, and sovereign.

Jinnah, Islam and Pakistan

By

Tarik Jan

[On the eve of 122nd birthday of Quaid-e-Azam Muhammad Ali Jinnah, Tolu-e-Islam is taking the liberty of reproducing below an article of Tarik Jan, which appeared in Dawn, of Oct3, 1998 for it is close to what Tolu-e-Islam has been explaining ever since the year 1938]

Ardeshir Cowasjee's piece on "Not the business of the state" (Sept 6, 1998) is a "special effect" exercise, a typical case of elite journalism in which the writer's mindset gives his own spin to events and history and thus creates a make-believe reality for the readers.

Worse, he builds his case for a secular Pakistan, on two sources: Jinnah's speech of August 11, 1947: Currimbhoy Chagla's 1927 impression of Jinnah as non-communal and a: "fervent nationalist." But the moment he thinks he has made a case it falls under the weight of history. Caught still in 1927, he forgets that in 1947, Chagla's non-communal Jinnah and the "fervent nationalist" succeeded in bringing about a Muslim state in the name of Islam.

His quoting Jinnah's broadcast to Australian people is equally problematic because he (Cowasjee) unwittingly equates Islamic governance with theocracy. The